اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ

(اللہ نے) آدم کو سب نام سکھائے پھر (جن چیزوں کے وہ نام تھے) ان کو ملائکہ کے سامنے (پیش)

فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ

کرکے فرمایا (کہ) اگر تم درست بات کہہ رہے ہو تو تم مجھے ان کے نام بتاؤ

صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا

۳۲ انہوں نے کہا تو بے عیب ہے جو (کچھ)

قرار دیا جاسکتا ہے۔

ملائکہ کے کاموں ان کی پیدائش کی غرض ان سے تعلق رکھنے کے ذرائع اور فوائد اور ایسے ہی بہت سے امور کے متعلق میری کتاب مَلَائِكَةُ اللّٰه دیکھنی چاہیئے۔ اس طویل مضمون کو یکجائی طور پر تفسیر میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں مختلف آیتوں کے ماتحت متعلقہ امور کو بیان کیا جائے گا۔

خلاصہ اس آیت کا یہ ہے کہ اس میں پہلی آیات کے اس دعویٰ کی دلیل دی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ ضرورت کے موقعہ پر اپنے مامور بھجواتا ہے اور شروع زمانہ سے ایسا کرتا چلا آیا ہے جب وہ ایسا مامور بھجواتا ہے تو فرشتوں کو اسکی آمد کی اطلاع دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اپنے حلقۂ نظام میں انکی تائید کی رَو چلائیں۔ اور یہ بھی کہ ہمیشہ سے یہ سنّت اللہ چلی آئی ہے کہ جب وہ مامور آتا ہے بدکار تو الگ رہے نیکوکار اور فرشتہ خصلت لوگ بھی بوجہ نبوت کے زمانہ سے بُعد کے اور اسکی خصوصیات سے ناواقفیت کے نبوت کی ضرورت کو نہیں سمجھتے اور اس نئے نظام کی حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ وقت کے نبی کے ذریعہ سے قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بعثت کی ضرورت کا انکار کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ بہرحال اس نظام کو قائم کرتا ہے اور دُنیا کی غیر معمولی بہتری کے سامان پیدا کر دیتا ہے اور اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کریم کے نزول کے وقت میں بھی ایسا ہی ہونا لازمی تھا اگر اس وقت کے کفار ان کی بعثت کی عدم ضرورت کے قائل ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں جب نبوت کی ابتداء ہوئی تھی تو ملائکہ تک اسکی ضرورت کو نہیں سمجھ سکتے تھے مگر آخر واقعات نے ان سے اس کی عظمت کا اقرار کروا کر چھوڑا۔

آدمؑ

۳۲ حل لغات۔ آدَمَ: ابوالبشر صلوٰت اللہ علیہ کا نام ہے بعض لوگوں نے اسے عجمی قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مشتق ہے اور میرے نزدیک یہی درست ہے اس صورت میں اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ علم بھی ہے اور وزنِ فعل پر بھی ہے اگر مشتق مانا جائے اور یہی بھی یہی درست۔ تو پھر آدم کا نام اس لئے آدم رکھا گیا کہ وہ لوگوں کو ایک تمدن پر جمع کرنے والے تھے چنانچہ کہتے ہیں اَدَمَ بَيْنَهُمْ (يَاْدِمُ) اَدْمًا: اَلَّفَ وَوَفَّقَ لوگوں کو جمع کیا۔ یا پھر اس وجہ سے ان کو آدم کہا گیا کہ وہ مختلف عناصر سے بنے تھے۔ اور ان میں مختلف قویٰ جمع کر دیئے گئے تھے کیونکہ اَدَمَ الْخُبْزَ کے معنی ہیں خَلَطَهُ بِالْاِدَامِ کہ روٹی کو سالن کے ساتھ ملا دیا۔ یا اس لئے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے لئے نمونہ تھے۔ چنانچہ جب اَدَمَ اَهْلَهٗ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں صَارَ لَهُمْ اُسْوَةً کہ وہ اپنے خاندان کے لئے نمونہ بن گیا۔ یا اس وجہ سے کہ وہ سطح زمین پر رہتے تھے کیونکہ

تلاوت آیت وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ

سطحِ زمین کو آدِیْمُ الْاَرْضِ کہتے ہیں۔ یا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ایک وسیلہ تھے۔ کیونکہ اَلْاُدْمَۃُ کے معنے اَلْوَسِیْلَۃُ کے بھی ہیں (اقرب)

اَلْاَسْمَآءَ

اَلْاَسْمَآءُ:۔ اِسْمٌ کی جمع ہے۔ اور اَلْاِسْمُ کے معنے ہیں اَللَّفْظُ الْمَوْضُوْعُ عَلَی الْجَوْھَرِ وَالْعَرَضِ لِتَمْیِیْزِہٖ کہ جو لفظ کسی چیز کی حقیقت کے بیان کے لئے اور اسکی صفات کے بیان کے لئے لاتے ہیں اسے اسم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے نیز کہتے ہیں اِسْمُ الشَّیْءِ عَلَامَتُہٗ کہ کسی چیز کو پہچاننے کے لئے جو اس کے بالمقابل لفظ رکھا جاتا ہے اسے اس کا اسم کہتے ہیں (اقرب) کلیات ابی البقاء میں ہے اَلْاِسْمُ:۔ ذَاتُ الشَّیْءِ وَالْاِسْمُ اَیْضًا اَلصِّفَۃُ کہ اسم اس کو بھی کہیں گے کہ جو کسی چیز کی حقیقت اور ذات کو بیان کرے۔ اور اس کو بھی کہیں گے جو اس چیز کی صفات کو بیان کرے (کلیات)

عَرَضَھُمْ

عَرَضَھُمْ:۔ عَرَضَ الشَّیْءَ لَہٗ کے معنے ہیں اَظْھَرَہٗ لَہٗ اس کے سامنے کسی چیز کو پیش کیا۔ اور جب عَرَضَ الْمَتَاعَ لِلْبَیْعِ کہیں تو معنے یہ ہونگے کہ اَظْھَرَہٗ لِذَوِی الرَّغْبَۃِ لِیَشْتَرُوْہُ کہ سامان خریداروں کے سامنے پیش کیا۔ اور عَرَضَ الشَّیْءَ عَلَیْہِ کے معنے ہیں اَرَاہُ اِیَّاہُ:۔ اسے کوئی چیز دکھائی۔ (اقرب)

آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں کیا مراد۔

اَنْۢبِئُوْنِی

اَنْۢبِئُوْنِی:۔ اَنْۢبِئُوْنِی امر جمع کا صیغہ ہے۔ اور اَنْبَاہُ الْخَبَرَ کے معنی ہیں خَبَّرَہٗ اس کو خبر دی (اقرب) پس اَنْۢبِئُوْنِی کے معنے ہونگے مجھے خبر دو۔

صٰدِقِیْنَ

صٰدِقِیْنَ:۔ صَدَقَ (یَصْدُقُ) صَدْقًا وَصِدْقًا سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اور صَدَقَ فِی الْحَدِیْثِ کے معنے ہیں اس نے سچی سچی بات کہی (اقرب) صَدَقَہُ الْحَدِیْثَ اَنْبَاہُ بِالصِّدْقِ اسے اس نے جو بات کہی وہ درست تھی (اقرب) تاج العروس میں ہے صَدَقَنِیْ فُلَانٌ: قَالَ لِیَ الصِّدْقَ یعنی اس نے جو بات کہی درست تھی (تاج) بخاری اور مسلم میں حدیث ہے کہ ایک دفعہ جبرائیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا۔ اور آپ کے جواب پر اس نے کہا صَدَقْتَ یعنے آپ نے درست کہا۔ یہ نہیں کہ آپ نے سچ بولا۔ پس اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کے معنے ہونگے اگر تم درست بات کہہ رہے ہو۔

تفسیر۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے کیا نام سکھائے اس میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ اشیاء کے نام سکھائے مثلاً پیالہ کا نام پیالہ۔ ہنڈیا کا نام ہنڈیا سکھایا یعنی زبان سکھائی (دُرِّ منثور) بعض نے اسپر یہ زیادتی کی ہے کہ تمام زبانیں سکھائیں (فتح البیان) یہ معنے بالکل خلافِ عقل و نقل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آدم کو اسکی اولاد کے نام بتائے (دُرِّ منثور)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ظاہر الفاظ میں نہیں فرمایا کہ کیا نام سکھائے اس وجہ سے اختلاف ہوا ہے لیکن اگر ہم قرآن کریم کو غور سے دیکھیں تو آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اَسْمَاء سے کیا مراد ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانوں کے متمدن ہونے کی صورت میں ان کے لئے ایک زبان کی ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے ضرور آدم کو زبان کا علم سکھایا ہوگا لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے ایک خاص اسماء بھی ہیں جن کا سیکھنا انسان کے دین اور اخلاق کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور جن کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سکھا سکتا۔ پس اسی جگہ جن اسماء کے سکھانے کا ذکر ہے ان سے وہ اسماء ضرور مراد ہیں اور ان اسماء کا قرآن کریم کی اس آیت میں ذکر ہے وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ سَیُجْزَوْنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (اعراف ع ۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ تمام نیک ناموں یعنی صفات کا مالک ہے پس اللہ کو ان ناموں سے یاد کیا کرو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں یعنی صفات میں غلط راستہ کو اختیار کرتے ہیں اور شک اور جھگڑے سے کام لیتے ہیں وہ اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے اس آیت سے ظاہر ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ کے اسماء یعنی صفات کا صحیح علم حاصل کئے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کا

عرفان حاصل نہیں کر سکتا اور اس کے فضلوں کا وارث نہیں ہو سکتا (۲) ان اسماء یعنی صفات کا صحیح علم اسی کے سکھانے سے آ سکتا ہے جو لوگ اپنے خیال اور عقل سے کام لیتے ہیں وہ ضرور غلطی کرتے ہیں اور اسماءِ الٰہیہ کا صحیح علم حاصل نہیں کر سکتے۔ پس آدم چونکہ مذہب کے قیام اور انقطاع سے مخلوق کے وصال کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے ضروری تھا کہ انہیں اسماءِ الٰہیہ سکھائے جاتے تا ان کی امت ان ناموں کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو شناخت کرتی اور اس سے تعلق پیدا کرتی اور اگر وہ نام نہ سکھائے جاتے تو اس کے ملحد اور بے دین ہونے کا خطرہ تھا۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ اسماءِ الٰہیہ کا آدم کو سکھانا ضروری تھا تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ جن اسماء کے سکھانے کا اس آیت میں ذکر ہے ان میں اسماءِ الٰہیہ ضرور شامل تھے بلکہ مذہب کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی نام اصل میں مقصود تھے اور ان کے سوا جو نام بھی ہوں وہ ان کے تابع ہونگے۔ سابق مفسرین میں سے مظہری نے اسماء کے معنی اسماءِ الٰہیہ کے ہی کئے ہیں (فتح البیان) مصنف فتح البیان نے اسے بے دلیل قرار دیا ہے مگر جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے یہ معنی سب معنوں سے زیادہ با دلیل ہیں۔

ان معنوں کی تعیین اس امر سے بھی ہو جاتی ہے کہ اگلی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اسماء آدم کو سکھائے گئے تھے فرشتے ان سے پوری طرح واقف نہ تھے اور وہ اسماء جن سے فرشتے فرداً فرداً کلی طور پر واقف نہیں صفات الٰہیہ ہی ہیں کیونکہ ان کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (نحل ع ۶) انہیں جو حکم دیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں کرتے اور کر نہیں سکتے۔ اور جب فرشتے وہی کچھ کرتے ہیں جو انہیں کہا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی بخشش اور خدا تعالیٰ کی ستاری اور خدا تعالیٰ کی قہاری کی صفات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان ہی ہے جسے خدا تعالیٰ نے علم دیکر مقدرت دی ہے کہ وہ جو راستہ چاہے اپنے لئے اختیار کرے اور خطا اور نسیان کا اسے محل بنایا ہے وہ خدا تعالیٰ کے علم کے بعد کبھی نافرمانی کرتا ہے اور کبھی توبہ اور کبھی نسیان کا مرتکب ہوتا ہے اور کبھی پھر صحیح راستہ کی طرف واپس آتا ہے اور اسی طرح خدا تعالیٰ کی بخشش اور اس کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کبھی نافرمانی پر اصرار کر کے خدا تعالیٰ کے غضب کو بھڑکاتا ہے پس صفاتِ الٰہیہ کا کامل علم انسان کو ہی حاصل ہوتا ہے ملائکہ کو نہیں۔ وہ صرف اس صفت کو ہی جانتے ہیں جو ان سے متعلق ہے اسی لئے اس آیت میں كُلَّهَا کا لفظ رکھ کر اس پر زور دیا ہے کہ گو ملائکہ اپنے ساتھ تعلق رکھنے والی ایک صفت یا ایک سے زیادہ صفات سے تو واقف ہوتے ہیں مگر انسان تمام صفات الٰہیہ سے واقف ہوتا ہے وہ رحیم ہے یہ بھی رحیم بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ غفار ہے یہ بھی غفار بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ قہار ہے یہ بھی قہار بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ جبار ہے یہ بھی جبار بننے کی قابلیت رکھتا ہے وہ شکور ہے یہ بھی شکور بننے کی قابلیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرشتے ان سب صفات کے حامل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً موت کے فرشتے ہیں ان کا کام صرف جان نکالنا ہے وہ کسی پر رحم نہیں کر سکتے۔ رزق پر مامور فرشتے کسی کی جان نہیں نکال سکتے۔ کلام الٰہی لانے والے فرشتے کوئی اور کام نہیں کر سکتے۔ مگر ایک کامل انسان اپنے اپنے موقعہ پر جلاتا بھی ہے مارتا بھی ہے بخشتا بھی ہے اور سزا بھی دیتا ہے پس انسان تمام صفات الٰہیہ کا حامل ہے مگر فرشتے صرف ایک ایک یا چند صفات کے حامل ہیں اس لئے انسان کو صفات الٰہیہ کا جو کامل علم دیا گیا ہے وہ فرشتوں کو نہیں دیا گیا اور اس کی بنیاد آدم کے ذریعہ سے اور ان کے وقت سے رکھی گئی ہے ان سے پہلے کا انسان چونکہ کامل نہ تھا وہ یہ علم نہ رکھتا تھا اور تمام صفاتِ الٰہیہ سے واقف نہ کیا گیا تھا۔

(حاشیہ: انہیں سکھانے سے مراد صفات الٰہیہ کا علم۔)

(حاشیہ: آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا میں كُلَّهَا کی قید کا مطلب)

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے زبان کا مفہوم بھی اس آیت کے مفہوم میں بطور تنزّل شامل ہے۔ کیونکہ تمدّن کے قیام کے لئے کسی زبان کا ہونا ضروری تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زبان کے اصول سکھائے جن کے مطابق انہوں نے زبان کا علم جاری کیا اور اسی آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان عربی زبان تھی کیونکہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ آدم کو اسماء مسمّیات کے ذریعہ سے سکھائے گئے تھے۔ یعنی جس زبان کا انہیں علم دیا گیا تھا اسکی بناء مسمّیات اور اسماء کے اتحاد پر تھی یعنی ہر چیز کا نام اسکی خصوصیت کی بناء پر رکھا گیا تھا نہ کہ بے تعلق اور بے ربط۔ اور یہ خصوصیت صرف عربی زبان میں ہے کہ اس کے تمام اسماء مسمّیات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں یہ بات نہیں ہے ان زبانوں میں نام سے صرف شناخت کا فائدہ حاصل کیا گیا ہے اگر ان ناموں کو بدل دیا جائے تو بھی کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا مثلاً اردو میں غلّہ سے بنائی ہوئی غذا کو روٹی کہتے ہیں انگریزی میں بریڈ اور فارسی میں نان۔ اگر ان ناموں کی جگہ مثلاً جوٹی یا جریڈ یا پان۔ اس چیز کے نام رکھ دئے جائیں تو کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا مگر عربی زبان میں اس چیز کا نام خُبْزٌ ہے جو با معنیٰ ہے۔ عربی زبان میں خ ب ز جمع ہوں تو ان کے معنوں میں عمل اور پھولنے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بَزَخَ کے معنی ہیں سینہ کو باہر نکالا اور خَزَبَ کے معنی ہیں بغیر بیماری اور نقص کے موٹا ہو گیا اور خَبَزَ کے معنے ہیں جلدی جلدی ہاتھ مار کے عمل کیا پس خُبْزٌ کے معنے ہوئے وہ چیز جسے جلدی جلدی ہاتھوں سے تیار کیا جائے اور وہ موٹی ہو جائے اور پھول جائے اور یہ روٹی کا عین نقشہ ہے۔ روٹی کو جلدی جلدی ہاتھ مار کر تیار کیا جاتا ہے اور آگ میں رکھنے کے بعد وہ پھول جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ روٹی کے لئے اگر عربی زبان میں خُبْزٌ کی جگہ کوئی اور لفظ رکھا جائے تو اس سے روٹی کی حقیقت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ روٹی کا مفہوم خ ب ز

آیت عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ سے مراد خدا تعالیٰ کا آدم کو زبان کے اصول سکھانا۔

آدم علیہ السلام کو عربی زبان کے اصول سکھائے گئے

عربی زبان اُمّ الالسنہ ہے۔

کے حروف کے ملانے سے ہی پیدا ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نام ربّ کو لے لو۔ ربّ کے معنے تربیت کرنے اور ادنیٰ سے اعلیٰ حالت تک پہنچانے کے ہیں اس لفظ کی جگہ کوئی اور لفظ رکھو تو یہ غرض کبھی پوری نہ ہوگی۔ پھر عربی میں آسمان کو سماء کہتے ہیں س م و جس سے یہ لفظ بنا ہے بلندی اور ارتفاع پر دلالت کرتا ہے مگر آسمان فارسی کا لفظ یا سکائی انگریزی کا لفظ اس حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا پس عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جس میں سب نام نام والے کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں اگر ان ناموں کو بدل دو تو وہ اس حقیقت کو ظاہر نہیں کریں گے بلکہ صرف ایک علامت رہ جائیں گے لیکن دوسری زبانوں میں اس حقیقت کا نام و نشان نہیں پایا جاتا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہ۔ پس زبان سکھانے کے معنوں سے یہ مراد لی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو ایک ایسی زبان سکھائی جو بے معنے اور بے ربط نہ تھی بلکہ اس کی بُنیاد فلسفہ پر تھی اور اس کے تمام لفظ با معنیٰ تھے یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان سکھائی جو بعد میں دوسری زبانوں کی ماں بنی (اس لطیف نکتہ کے لئے بانی سلسلہ احمدیہ کی کتاب مِنَنُ الرَّحْمٰن دیکھو جس میں نہایت لطیف پیرایہ میں عربی زبان کے اُمّ الالسنہ ہونے کا مسئلہ بتایا گیا ہے)

میری مراد اوپر کی تحریر سے یہ ہرگز نہیں کہ عربی زبان اپنی موجودہ شکل میں آدم علیہ السلام کو سکھائی گئی یا یہ کہ آدم علیہ السلام کے بعد اس نے ترقی نہیں کی بلکہ میری مراد صرف یہ ہے کہ اس آیت کے مفہوم کے مطابق عربی زبان کے بعض اصول پر اس وقت بُنیاد رکھی گئی تھی باقی رہا یہ کہ وہ بعد میں تبدیل بھی ہوئی یا اس میں اور الفاظ کی ترقی ہوئی اس کا نہ اس مسئلہ سے تعلق ہے نہ اس سے عربی زبان کی اس افضلیت یا خصوصیت میں کوئی فرق آتا ہے اصول وہی ہیں ہاں ان اصول کی اتباع میں زبان آگے ترقی کرتی چلی گئی ہے اور آئندہ بھی ترقی کر سکتی ہے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کی ایک اور تفسیر بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عَلَّمَ کے معنے خارجی ذرائع سے سکھانے کے علاوہ طبعی طور پر سکھانے کے بھی ہوں یعنے یہ مطلب بھی ہو کہ آدم کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے مختلف علوم کے سیکھنے کا مادہ رکھا یہ ظاہر ہے کہ ہر جنس کے افراد کو اپنی جنس سے تعلق رکھنے والے علوم کو بھی ایک دوسرے سے کم و بیش سیکھتے ہیں لیکن جو علوم ان کے دائرہ سے باہر ہوں انہیں وہ بالکل نہیں سیکھ سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ ہر جنس کے لئے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوتوں کے دائرے مقرر کئے ہیں انسان کے علم حاصل کرنے کا دائرہ اور ہے طوطے کا اور مینا کا اور گھوڑے کا اور۔ اور کتے کا اور۔ مینا طوطا بھی سکھانے سے چند لفظ سیکھ لیتے ہیں لیکن پوری طرح بات سمجھ کر ہر قسم کے موضوع پر بات نہیں کر سکتے لیکن انسان ایسا کر سکتا ہے گھوڑے اور کتے بھی بعض کرتب سیکھ لیتے ہیں لیکن انسان کی طرح ان کا یہ سیکھنا وسیع نہیں ہوتا۔ پس ایک معنی اس آیت کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر وسیع علوم سیکھنے کی قابلیت پیدا کی اس صورت میں عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ کے یہ معنے ہونگے کہ اس نے مختلف اشیاء کے خواص سمجھنے کی قابلیت انسان میں پیدا کی چنانچہ آدم کے وقت سے اس وقت تک انسان مختلف علوم میں ایجادیں کر رہا ہے اور ہر روز اس کا علم پہلے سے بڑھ رہا ہے اس صورت میں اسماء کے معنی خواص اور صفات کے ہی ہونگے مگر صفات الٰہیہ کی بجائے صفات طبعیہ کے معنے کئے جائیں گے منطقی اصطلاح کی روشنی میں ان معنوں کی تشریح یہ ہوگی کہ آدم کو ہم نے حیوانِ ناطق بنایا یعنے مختلف اشیاء پر غور کرنے اور اس کی کنہ کو پہنچنے اور دوسروں کو سکھانے کی قابلیت اس میں رکھی جیسا کہ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خلافت کا تعلق ان اسماء کے سکھانے سے ہے جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کیونکہ پہلی آیت میں صرف اس امر کا اظہار تھا کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے ایک خلیفہ بنانے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بعض اسماء سکھائے اس کے بعد کی دو آیتوں میں انہی اسماء کے متعلق باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے بعد فرماتا ہے کہ ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ آدم کی خلافت ان اسماء کے سکھانے کے بعد شروع ہوئی اور اسی وقت سے ملائکہ کو اس کی تائید اور نصرت کا حکم ملا پس پہلی آیت آدم کی خلافت کی خبر نہیں دیتی تھی بلکہ صرف خلافت کی خبر دیتی تھی اس کے بعد جب آدم علیہ السلام کو اسماء سکھائے گئے تو یہ گویا اس شخص کی تعیین کا اظہار تھا جسے اللہ تعالیٰ نے خلافت کے لئے چنا تھا۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں عَلَّمَ کے معنے ذریعے سکھانے کے

یہ جو فرمایا گیا ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا آدم کو اللہ تعالیٰ نے سب نام سکھائے اس سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ تمام صفاتِ الٰہیہ کا مکمل علم آدم کو دیا گیا یا زبان کا مکمل علم آدم کو دیا گیا کیونکہ کُلّ کا لفظ عربی زبان کے محاورہ کے مطابق ضروری نہیں کہ تمام افراد جنس پر مشتمل ہو بلکہ بسا اوقات یہ لفظ ضرورت کے مطابق اشیاء پر بولا جاتا ہے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر کُلّ کا لفظ ان معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ فرماتا ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (انعام ع ۵) یعنی جب تجھ سے پہلی قوموں نے اس نصیحت کو بھلا دیا جو انہیں کی گئی تھی تو ہم نے پہلے تو ہر قسم کی ترقیات کے دروازے ان پر کھول دیئے (اور پھر ان پر عذاب نازل کیا) جیسا کہ ظاہر ہے اس آیت میں کُلّ کے لفظ کے یہ معنی نہیں کہ ہر نعمت دنیا کی ان کو ملی بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ اس زمانہ کی اور ان کے ملک کی بڑی بڑی نعمتوں سے انہیں حصہ ملا۔ اسی طرح اہل مکہ کی نسبت آتا ہے اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰۤى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا (قصص ع ۶) یعنی کیا اہل مکہ کو ہم نے ایک عزت والے اور محفوظ مقام میں جگہ نہیں دی کہ ہماری طرف سے انعام کے طور پر اس کی

عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ کے یہ معنے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اشیاء کے خواص سمجھنے کی قابلیت انسان میں پیدا کی۔

طرف مرقسم کے میوے لائے جاتے ہیں۔ اس آیت میں بھی کُلّ سے تمام دنیا کے میوے مراد نہیں بلکہ بہت سے میوے جو اہلِ مکہ کی صحت کی درستی اور ان کی لذت کا سامان پیدا کرنے کے لئے ضروری تھے مُراد ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور کئی آیات میں کُلّ کا لفظ بہت سے یا حسبِ ضرورت کے معنوں میں استعمال ہُوا ہے۔

عربی زبان کے علاوہ باقی سب زبانوں میں بھی کُلّ یا اس کے ہم معنی الفاظ علاوہ اپنے اصلی معنوں کے کثرت یا حسبِ ضرورت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور سیاق و سباق یا محلِ استعمال سے ان کے اصلی معنوں اور ان مجازی معنوں میں فرق کیا جاتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو کل اسماء سکھانے کا مطلب۔

جیسا کہ مَیں نے اوپر بتایا ہے آیت زیرِ تفسیر میں بھی عَلَّمَہَا سے مُراد نہ تمام صفاتِ الٰہیہ مُراد ہیں اور نہ انسان سے تعلق رکھنے والی سب صفات یا ان کا کامل علم مراد ہے کیونکہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ علم دین جو صفاتِ الٰہیہ سے تعلق رکھتا ہے دنیا پر آہستہ آہستہ کھولا گیا ہے اور اسکی پوری تکمیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ ع ۱) آج مَیں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر کمال تک پہنچا دی پس آدم علیہ السلام پر تمام صفاتِ الٰہیہ کا پورا انکشاف نہ ہُوا تھا بلکہ وہ انکشاف آہستہ آہستہ کامل ہوتا ہُوا رسول کریم صلعم کے ذریعہ سے اپنی انتہاء کو پہنچا اور آدم کو سب اسماء سکھانے کا صرف یہ مطلب ہے کہ ان کے زمانہ کے ساتھ جن صفاتِ الٰہیہ کے ظہور کا تعلق تھا اور جس حد تک تعلق تھا اسی حد تک انہیں ظاہر کیا گیا اسی طرح جو صفاتِ الٰہیہ کہ انسانوں سے متعلق نہیں ان کا انکشاف بھی کُلّ کے لفظ میں شامل نہیں۔ ہاں کُلّ کے لفظ سے انسانوں سے تعلق رکھنے والی کل صفات بھی مراد لی جا سکتی ہیں مگر اس صورت میں آیت کے یہ معنے ہونگے کہ کل صفات

ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ سے مراد

کے سمجھنے کی قابلیت آدم اور اس کی ذریت میں رکھی یعنی یہ تعلیم بالقوۃ اور بالاجمال تھی بالفعل اور بالتفصیل نہ تھی۔ بالفعل اور تفصیلاً یہ تعلیم مکمل صورت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے پوری ہوئی۔ اسی طرح زبان کے اسماء سکھانے سے یہ مراد نہیں کہ کل اسماء اور زبان کے مادے آدم علیہ السلام کو سکھائے گئے بلکہ اصول مراد ہیں جو بعد میں ترقی کرتے کرتے کامل عربی زبان کی شکل میں ظاہر ہوئے۔

یہ جو فرمایا کہ ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ پھر انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا اس سے مراد اسماء نہیں ہو سکتے کیونکہ اسماء کا لفظ عربی زبان کے قاعدہ کے مطابق مؤنث ہے چنانچہ اس سے پہلے اسماء کی طرف عَلَّمَہَا کے لفظ میں ھا کی ضمیر آ چکی ہے جو مؤنث ہے لیکن عَرَضَھُمْ میں جمع مذکر کی ضمیر آئی ہے پس معلوم ہُوا کہ ملائکہ کے سامنے اسماء نہیں پیش کئے گئے بلکہ جن کے نام تھے ان کے وجود پیش کئے گئے۔

اسی طرح عَرَضَھُمْ میں جو ھُمْ کی ضمیر استعمال ہوئی ہے اس سے بھی ظاہر ہے کہ جن کو پیش کیا گیا ہے وہ چیزیں نہ تھیں یعنی پیالے یا لوٹے یا ہنڈیاں پیش نہیں ہوئیں کیونکہ اگر ان چیزوں کا ذکر ہوتا تو بھی عَرَضَھَا آنا چاہیئے تھا کیونکہ بے جان چیزوں کی طرف بھی بلکہ جاندار اور غیر ذوی العقول کی طرف بھی عربی زبان میں ھُمْ کی ضمیر نہیں پھیری جاتی ھُمْ کی ضمیر صرف ذوی العقول کی طرف پھیری جاتی ہے پس عَرَضَھُمْ کے الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وجود ملائکہ کے سامنے لائے گئے وہ ذوی العقول تھے۔

عَرَضَھُمْ کے معنوں میں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ وجود عملاً پیش کئے گئے ہوں کیونکہ عَرَضَھُمْ کے ایک معنی دکھانے کے بھی ہیں پس اگر ھُمْ کی ضمیر آدم کی آئندہ نسل یا اس کے کامل ظہوروں کی طرف پھرائی جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ وہ مستقبلیات ملائکہ کو دکھائے یعنی کشف کے ذریعہ سے آئندہ ہونے والے مظاہر کا نقشہ ملائکہ کو دکھا دیا۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ کیا تھے سو سیاق و سباق پر

غور کر کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ملائکہ کو خلیفہ بنانے پر اس لئے تعجب تھا کہ اس کے سبب سے خونریزی ہوگی اور فساد ہوگا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ان صفاتِ الٰہیہ کے جو آدم اور اس کی نسل پر ظاہر ہونے والی تھیں کامل مظاہر دکھائے اور پوچھا کہ اگر تمہاری بات درست ہے تو پھر ان کے نام بتاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات رحم کی یا غضب کی جس طرح ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والی تھیں ان کا نقشہ ان وجودوں کے ذریعہ سے دکھایا اور ملائکہ سے پوچھا کہ کیا تم ان کی تفصیل بتا سکتے ہو۔

دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ آدم کو تعلیم اسماء کے بعد اور خلافت سونپنے کے بعد جو اعوان و انصار ملے اور جن کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی مختلف صفات کا ظہور ہُوا ان افراد کو ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور پوچھا کہ اگر تمہارا خیال درست ہے تو ان کے نام بتاؤ یعنی ان کی صفات کاملہ کی تفصیل بیان کرو مطلب یہ کہ یہ افراد تو صلح و آشتی کا نمونہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرنے والے ہیں اور آدم کے پیدا کردہ لوگ تو یہ ہیں ان سے سفکِ دم اور فساد کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور ان کے بالمقابل جو لوگ آدم کے دشمن ہیں یا اسکی تعلیم پر ظاہر میں ایمان لائے ہیں مگر سچے متبع نہیں اگر ان سے سفکِ دم یا فساد پیدا ہو تو ان کے اعمال کا آدم کس طرح ذمہ وار ہو سکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آج تک کوئی نبی بھی دنیا میں نہیں آیا جس کی بعثت کے ساتھ ساتھ سفکِ دم اور فساد بھی نہ ہُوا ہو مگر وہ سفکِ دم اور فساد اس کے یا اس کے اتباع کے اعمال کی وجہ سے یا ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ ان کے منشاء کے خلاف اور ان کے مخالفوں کی شرارتوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس جو فساد بظاہر نیا پیدا شدہ نظر آتا ہے وہ دیرینہ فساد کا اظہار اور اس کی آخری سرکشی کا شعلہ ہوتا ہے نبی فساد پیدا نہیں کرتا بلکہ شریروں کے اندرونی خبث کے اظہار کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اندرونی خبث باہر نہ آئے اس کا علاج اور قلع قمع بھی ناممکن ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے "یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا۔ صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹی کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے" (متی باب ۱۰ آیت ۳۴ تا ۳۶) ان فقرات میں حضرت مسیح نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ گو میں تو صلح کی تعلیم دیتا ہوں لیکن میرے مخالف اس صلح کے پیام کو جنگ کے اعلان میں بدل دیں گے اور مجھ پر ایمان لانے کی وجہ سے بھائی بھائی کا اور باپ بیٹے کا دشمن ہوگا اور اپنے اندرونی خبث کو شرارت اور فتنہ کی صورت میں ظاہر کرے گا اور اس طرح باوجود میری صلح کی تعلیم کے جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ میں جو صلح کا پیغامبر ہوں جنگ اور فساد کا بانی ہوں۔

اسی سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی نسبت فرماتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (ع ۲۶) تم پر جنگ فرض کی گئی ہے باوجود اس کے کہ وہ تم کو سخت ناپسند ہے یعنی مسلمان دل سے صلح جُو تھے مگر دشمن نے بار بار حملہ کر کے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ مسلمانوں کو جنگ کرنی پڑی اب ساری مخالف دنیا مسلمانوں کو ملامت کرتی ہے کہ انہوں نے فساد کیا اور سفکِ دما کیا اور یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جنگ پر مسلمانوں کو کفار نے مجبور کیا پس سفکِ دم کا الزام تو کفار پر ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔ وہ جو تلوار چلانے پر کسی کو مجبور کرتا ہے اگر مدمقابل کو مار لیتا ہے تب بھی وہی قاتل ہوتا ہے اور اگر خود مارا جاتا ہے تب بھی وہی قاتل ہوتا ہے کیونکہ اس نے دوسرے کو تلوار چلانے پر مجبور کیا۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ پیدا ہونے والے کاملین کو خواہ تقویٰ کے کامل ہوں یا کُفر کے کامل ہوں بطور کشف ملائکہ پر ظاہر کیا اور ان سے

پُوچھا کہ کیا تم ان صفات کو بتا سکتے ہو جو ان کے ذریعہ سے ظاہر ہونے والی ہیں۔ اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ آدم کے ذریعہ سے جو لوگ کامل ہونے والے تھے اور اس کی صفاتِ الٰہیہ کی تعلیم سے جو بہرہ ور ہونے والے تھے ان وجودوں کو ان کے سامنے کر کے پُوچھا کہ کیا تم ان کی صفات اور ان کے خواص کو ظاہر کر سکتے ہو (اور یہ مراد نہیں کہ محض نام جیسے زید بکر وغیرہ پوچھے) اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ آدم جن لوگوں کو پیدا کرے گا وہ سفک دم کرنے والے یا فساد کرنے والے نہ ہونگے بلکہ ان نیک طبع اور شریف لوگوں سے ان کے دشمن جھگڑا کر کے لڑائی کی طرح ڈالیں گے پس سفکِ دم کے وہ دشمن مجرم ہونگے نہ کہ آدم یا اس کے اتباع خواہ وہ کافر مُنہ سے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے کتنے ہی نعرے لگاتے رہیں۔

آیت اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ میں صٰدقین کے معنے درست بات کہنے کے ہیں۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کے یہ معنے نہیں کہ اگر تم سچ بول رہے ہو۔ فرشتوں کی نسبت اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق گناہ کا امکان ثابت نہیں پس اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کے یہ معنے نہیں کہ اگر تم جھوٹ نہیں بول رہے تو ان کی صفات بتاؤ بلکہ یہ معنی ہیں کہ اگر تمہاری بات درست ہے تو ان کی صفات بتاؤ۔ یہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ صَدَقَ کے معنے صرف سچ بولنے کے نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنے درست بات کہنے کے بھی ہوتے ہیں اور یہی معنی اس آیت میں ہیں۔

آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ میں جدید طریقۂ تعلیم کنڈرگارٹن کی طرف اشارہ

اوپر جو معنے اس آیت کے کئے گئے ہیں ان کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کو اپنے بعد آنے والے انبیاء اور اپنی جماعت کے افراد کی قابلیتوں کا بھی ایک حد تک علم دیا جاتا ہے کیونکہ آدم کے بعد آنے والے انبیاء کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہ سلوک نظر آتا ہے کہ وہ اپنے بعد آنیوالے ایک یا ایک سے زیادہ نبیوں کی خبر دیتے رہے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو جامع جمیع کمالات تھے ان کی تو ہر ایک نبی نے ہی خبر دی ہے اسی طرح انبیاء کی زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اتباع میں سے جو خاص وجود ہوتے ہیں ان پر ان کے حالات بھی اجمالی طور پر منکشف کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی نبی نے اپنے انصار چننے میں غلطی نہیں کی یعنی ان کے انصار کی اکثریت کبھی غلطی پر جمع نہیں ہوئی کاش شیعہ لوگ اس حقیقت کو دیکھتے اور خلفاء کی مخالفت سے باز آتے۔

لطیفہ:۔ آجکل کے تعلیم کے طریقوں میں سے جدید ترین طریقہ کنڈرگارٹن کہلاتا ہے جو جرمنی کی ایجاد ہے اس کے لفظی معنے تو بچوں کے باغ کے ہیں مگر محاورہ میں اس کے معنے بچوں کا سکول کے لئے جاتے ہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس طریقِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ کتابوں سے علم پڑھانے کی بجائے چیزیں دکھا کر ان کے نام سکھائے جائیں اس طرح بات اچھی طرح یاد رہتی ہے اور بچہ حافظہ پر بوجھ پڑے بغیر سبق یاد کر لیتا ہے اس طریقِ تعلیم میں یا تو عملاً باغ میں بچہ کو پھرا کر مختلف اشیاء کے نام یاد کرائے جاتے ہیں اور یا تصویروں اور مٹی اور لکڑی کے بنے ہوئے نمونوں کو دکھا کر مختلف اشیاء کا علم دیا جاتا ہے یورپ کو اور خاصکر جرمنی کو اس طریقِ تعلیم پر بڑا ناز ہے مگر دیکھو کہ قرآن کریم کی اس مختصر آیت میں اسی کنڈرگارٹن کے طریق کو کس لطیف طور پر پیش کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم کو زبان اس طرح نہیں سکھائی کہ الفاظ یاد کرا تا بلکہ اشیاء کو پیش کر کے اور ان کے امثال دکھا کر ان کے نام بتائے اور جب فرشتوں کے سبق کا وقت آیا تو انہیں بھی صرف الفاظ میں جواب نہیں دیا گیا بلکہ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فرشتوں کے سامنے بھی اصل اشیاء کو یا ان کے کشفی وجود کو پیش کر کے پھر آدم سے کہا کہ ان کے نام بتاؤ کیونکہ علم سکھانے کا مؤثر ترین طریقہ یہی ہے کہ اصل چیز یا اس کے نمونہ یا تصویر کو پیش کر کے اس کا نام اور کام بتایا جائے اس طرح سبق خوب یاد رہتا ہے پس پہلا سبق جو کنڈرگارٹن کے اصول پر دیا گیا وہ نہ تھا جو جرمنی میں دیا گیا بلکہ جنّت یا باغ آدم پہلا کنڈرگارٹن کا سکول تھا جس میں خدا تعالیٰ کی وحی نے پہلے آدم کو اور پھر آدم کے ذریعہ

عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ قَالَ يٰٓاٰدَمُ

تُو نے ہمیں سکھایا ہے اس کے سوا ہمیں کسی قسم کا علم نہیں ہے۔ یقیناً تو ہی کامل علم والا (اور) اپنے قول اور فعل میں حکمت کو مدنظر رکھنے والا ہے ۳۳ (اس پر اللہ نے) فرمایا اے آدم

سے فرشتوں کو اسمار کا سبق مسمیات دکھا کر دیا تا اس کا نقش گہرا ہو اور پوری کیفیت ذہن میں سما جائے۔

اللہ تعالیٰ کے تعلیم دینے کی ایک تازہ مثال اس زمانہ میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ بانیٔ سلسلہ احمدیہ جنہوں نے کسی باقاعدہ مدرسہ میں تعلیم نہ پائی تھی انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم سے عربی زبان میں کتب لکھنی شروع کیں تو ایک دفعہ انہیں ایک رات میں چالیس ہزار عربی الفاظ سکھائے گئے چنانچہ اس کے بعد انہوں نے دعویٰ سے عربی کتب لکھیں اور دنیا کو چیلنج دیا کہ اس قسم کی فصیح عبارت اور لطیف مضامین پر مشتمل کتب الگ الگ یا مل کر لکھ کر پیش کریں لیکن باوجود اس کے کہ ان کتب کو عربی بلاد میں بھی کثرت سے پھیلایا گیا آج تک کوئی ان کی مثل نہیں لکھ سکا اور یہ معجزہ قرآنی معجزہ کی تائید میں اور اس کے افاضۂ کمال کے ثبوت میں تھا۔

اس جگہ ایک سوال کا جواب دیا جانا ضروری ہے کہا جا سکتا ہے کہ اگر ملائکہ سیکھ نہ سکتے تھے تو پھر انہیں نام بتانے سے کیا فائدہ تھا اور اگر وہ سیکھ گئے تو آدم و ملائکہ کی قابلیت کے تفاوت کا مسئلہ غلط ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ آدم کا علم تفصیلی ہے اور ملائکہ کا اجمالی۔ اجمالی طور پر کسی شے کا علم ان افراد کو بھی ہو جاتا ہے جو اس کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے ملائکہ کو صرف یہ بات بتانی منصود تھی کہ آدم اپنی قابلیت سے صفاتِ الٰہیہ کا علم جس رنگ میں حاصل کر سکتا ہے ملائکہ نہیں کر سکتے اور اس قدر بات کا ملین کا وجود پیش کرنے سے ان کی سمجھ میں آ سکتی تھی ورنہ یہ مراد نہیں کہ کاملین کا وجود دیکھنے کے بعد فرشتے تمام صفات الٰہیہ کا تفصیلی علم سیکھ گئے۔

۳۳ حل لغات۔ سُبْحَانَكَ۔ سُبْحَانَ مصدر ہے اور اس کے معنی عیوب سے پاک سمجھنے اور پاک کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ اَیْ اُبَرِّئُ اللّٰہَ مِنَ السُّوْءِ بَرَاءَۃً کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو تمام عیوب سے پاک سمجھتا ہوں (اقرب) مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۳۱؎

اَلْحَكِيْمُ اَلْحَكِيْمُ: اَلْعَالِمُ، عالم صَاحِبُ الْحِكْمَۃِ، حکمت والا۔ اَلْمُتْقِنُ لِلْاُمُوْرِ تمام کاموں کو اچھی طرح کرنے والا جس کے کاموں کو کوئی بگاڑ نہ سکے (اقرب) حِكْمَۃٌ کے معنے ہیں عَدْل۔ عِلْم۔ حِلْم۔ یعنی دانائی۔ مَا يَمْنَعُ مِنَ الْجَهَالَۃِ یعنی ہر وہ بات جو جہالت سے روکے۔ كُلُّ كَلَامٍ مُوَافِقٍ لِلْحَقِّ۔ ہر وہ کلام جو سچائی کے موافق ہو۔ بعض کے نزدیک اس کے معنے وَضْعُ الشَّيْءِ فِيْ مَوْضِعِهٖ کے ہیں یعنی ہر امر کو اس کے مناسب حال طور پر استعمال کرنا۔ نیز اس کے ایک معنی ہیں صَوَابُ الْاَمْرِ وَسَدَادُہٗ بات کی حقیقت اور اس کا مغز۔ (اقرب) حَكَمَ جو حَكِيْم کا مادہ ہے

اس سوال کا جواب کہ اگر ملائکہ سیکھ نہ سکتے تھے تو ان کو نام بتانے سے کیا فائدہ؟ اس کے معنے ہیں مَنَعَ مَنْعًا لِلْاِصْلَاحِ۔ اصلاح کی خاطر کسی کو کسی کام سے روکنا۔ اور اسی وجہ سے جانور کی لگام کو حَكَمَۃٌ کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

اَبَنِیْ حَنِيْفَۃَ اَحْكِمُوْا سُفَهَائَكُمْ

اے بنی حنیفہ اپنے بیوقوفوں کو سمجھاؤ اور بری باتوں سے روکو (مفردات)

تفسیر۔ ملائکہ نے ان وجودوں کے دکھلائے جانے پر کہا کہ اے اللہ تو پاک ہے ہمیں تو اسی قدر علم ہے جس قدر تُو نے ہمیں دیا ہے تُو بہت جاننے والا اور حکمت والا خدا ہے یعنی آدم کی خلافت کا مسئلہ ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا اور ہمارا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے خونریزی اور فساد ہوگا مگر اب اس اظہار

سُبْحَانَكَ سے کہ گو اس کے خلیفہ ہونے پر خونریزی اور فساد ہوگا مگر اس کی ذمہ داری آدم پر نہ ہوگی بلکہ جس مقام پر آدم کو کھڑا کیا

گیاہے اس کا یہ بھی ایک لازمہ ہے جس کا باعث بیرونی دشمن یا اندرونی کمزور وجود ہوتے ہیں نہ کہ خلیفہ اور اس کے ساتھی۔ مگر ہم اب سمجھ گئے ہیں کہ اس حالت کا پیدا کرنا حکمت سے خالی نہیں اور یہ فعل تیرے حکیم ہونے پر دلالت کرتاہے۔

بعض اعتراض کا جواب کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو سکھایا تو وہ سیکھ گیا فرشتوں کو نہ سکھایا ورنہ سیکھتے پھر اس میں فرشتوں کا کیا قصور؟

بعض لوگ غلطی سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو سکھایا تو وہ سیکھ گیا فرشتوں کو نہ سکھایا وہ سیکھے پھر اس میں فرشتوں کا کیا قصور۔ اور ان کی بات کو غلط کہنا کس طرح درست ہوسکتاہے۔ یہ اعتراض صرف اس وجہ سے پیدا ہُواہے کہ پہلی آیت جس میں خلافت کا سلسلہ شروع کرنے کا اعلان ہے اس کے یہ معنی سمجھے گئے ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا (۲) فرشتوں نے جواب میں کہاکہ ہم جو تیری تسبیح کرنے والے موجود ہیں ہماری موجودگی میں کسی اور خلیفہ کی کیا ضرورت ہے کیا ہم کافی نہیں۔

لیکن یہ دونوں نتیجے جو اخذ کئے گئے ہیں غلط ہیں۔

(۱) اس آیت میں کسی مشورہ کا ذکر نہیں۔ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہاکہ مَیں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ان الفاظ میں مشورہ کرنے کا کوئی اشارہ تک نہیں اگر مشورہ ہوتا تو یُوں کہنا چاہیئے تھا کہ اے فرشتو! بتاؤ کہ مَیں زمین میں کوئی خلیفہ بناؤں یا نہ بناؤں مگر اس قسم کا کوئی جملہ نہ اس جگہ ہے نہ قرآن کریم میں کسی اور جگہ ہے پس جب مشورہ لیا ہی نہیں گیا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے جن کو علم تھا ہی نہیں مشورہ کیوں لیا اور اگر مشورہ لیا تھا تو ان کے مشورہ پر اعتراض کیسا ؟ (۲) فرشتوں نے جو کچھ کہاہے جیساکہ اس آیت کی تفسیر میں بتایا جاچکاہے اس میں ہرگز یہ کوئی ذکر نہیں کہ ہماری موجودگی میں کسی اور خلیفہ کی کیا ضرورت ہے اور وہ ایسا کہہ بھی کب سکتے تھے جبکہ زمین پر خلیفہ بنانے کا ذکر تھا نہ کہ آسمان پر۔ فرشتوں نے جو کچھ کہا اس کے الفاظ سے ظاہرہے کہ وہ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ اس نئے نظام کی جو دُنیا پر قائم کیا جانے والاہے جبکہ اس کے ساتھ خونریزی اور فساد کا امکان بھی موجود ہے کیا ضرورت ہے پس ان کا سوال حقیقت کو سمجھنے کے لئے تھا نہ کہ خدا تعالیٰ پر اعتراض کے طور پر یا اپنے آپ کو خلافت کا مستحق ثابت کرنے کے لئے۔ اب انکے اس سوال کا صحیح جواب دو ہی طرح ہوسکتا تھا (۱) یا تو انہیں یہ بتایا جاتا کہ خلیفہ کے قیام کے بعد کوئی خونریزی یا فساد نہ ہوگا (۲) یا یہ بتایا جاتا کہ خونریزی اور فساد تو بیشک ہوگا لیکن اس کے باوجود یہ نظام ضروری ہے اور اس کے فوائد اسکے نقصانوں سے زائد ہیں چونکہ خلافت انسانیہ کے نظام کے متعلق یہی دوسرا جواب صحیح اور درست تھا اللہ تعالیٰ نے اسی جواب کو ملائکہ کے سامنے پیش کیاہے اس نے یہ نہیں کہاکہ خلافت انسانیہ کے ساتھ خونریزی اور فساد نہیں ہوگا بلکہ یہ بتایاہے کہ گو اس نظام کی وجہ سے کچھ لوگ خونریزی اور فساد کے مجرم ہونگے لیکن اس کے نتیجہ میں ایسے وجودوں کا بھی ظہور ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات کے حامل ہوں گے اور خدا تعالیٰ کے مظہر ہونگے اور ایسے وجودوں کو پیدا کرنا ان ناقص وجودوں کی موجودگی کے باوجود جو انسانوں میں سے ظاہر ہونگے صفات الٰہیہ کے ظہور کے لئے ضروری ہے اور نظام عالم کے لئے مفید۔ یہ جواب بھی دو طرح دیا جا سکتا تھا (۱) فلسفیانہ رنگ میں دلائل کے ساتھ (۲) عملی رنگ میں پہلے خلیفہ کی قوتوں کا اظہار کرکے اور اسکی نسل کے کاملین کو کشفی رنگ میں فرشتوں کو دکھاکر۔ ظاہرہے کہ یہ دوسرا طریق زیادہ اعلیٰ اور زیادہ مؤثرہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو اختیار کیا اور آدم کو صفات الٰہیہ کی تعلیم دی اور اس نے ان پر عمل کرکے بتادیا کہ صفات الٰہیہ کا کامل ظہور بغیر ایسے وجود کے جس میں خیر اور شر دونوں قسم کی طاقتیں موجود ہوں اور اسے دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کی مقدرت دی جائے اور پھر وہ محبت الٰہی کے جذبہ سے متأثر ہوکر خیر کی طاقتوں کو اپنے اندر نشوونما دے کر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرے ممکن نہیں پس چونکہ صفات الٰہیہ کے کامل ظہور کے لئے ایسے وجود کا ہونا جسے خیروشر کی تعلیم دے کر اپنے لئے

خود راستہ تجویز کرنے کی مقدرت دے دی جائے ضروری ہے ایسے ناقص افراد کے پیدا ہونے کے خطرہ کو بھی جو شر کی طاقتوں کو اختیار کرکے خونریزی اور فساد کریں برداشت کر لیا جائے گا۔ اگر یہ مقدرت نہ دی جائے اور اس وجود کو خیر پر مجبور کیا جائے تو وہ صفات الٰہیہ کا مظہر نہیں کہلا سکتا۔ صرف ایک بے جان اور بے مقدرت آلہ کار کہلا سکتا ہے۔

جواب کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ امر آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ یہ اعتراض کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو سکھایا اور فرشتوں کو نہ سکھایا تو پھر اس کا یہ پوچھنا کس طرح درست تھا کہ مجھے ان سمّیات کی صفات اور خواص سے اطلاع دو۔ درست نہیں۔ کیونکہ یہاں تو سوال ہی یہ تھا کہ ایسے وجودوں کی کیا ضرورت ہے جو گناہ بھی کر سکیں گے اور شریعت کے مجرم ہو سکیں گے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ بیشک وہ گناہ کے مرتکب بھی ہو سکیں گے مگر اس مقدرت کے باوجود ان میں سے کاملین کا نیکی کو اختیار کرنا اور صفات الٰہیہ کو اپنے وجود سے ظاہر کرنا اور پھر ایک نظام کے ماتحت دوسروں کو نیکی کی راہ پر چلانا ہی تو ان کے مقرب بارگاہ ہونے کا ذریعہ ہوگا اور یہی تو ان کے اعلیٰ کمالات کا ثبوت ہوگا اور جس طرح ان کامل وجودوں کو دکھا کر جو فرشتوں کے دائرۂ عمل سے اوپر نکل چکے ہوں اور صفاتِ الٰہیہ کو مجموعی طور پر بہتر رنگ میں ظاہر کرنے والے ہوں۔ فرشتوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا جا سکتا تھا اور کوئی ذریعہ انہیں حقیقتِ انسانیہ سے آگاہ کرنے کا ممکن نہ تھا پس یہ آیات قابلِ اعتراض نہیں بلکہ ان میں ایک اعلیٰ حقیقت ایک ایسے مکمل پیرایہ میں ظاہر کی گئی ہے کہ اس سے بہتر ذریعہ اور ممکن ہی نہیں۔

فرشتوں کا جواب ظاہر کرتا ہے کہ باوجود معترضین کے اعتراض کے جو وہ فرشتوں کی طرف سے کرتے ہیں فرشتوں کی اس جواب سے پوری تسلی ہو گئی اور انہوں نے اقرار کیا کہ ان کا علم محدود ہے اور انسان کا ان کے مقابل پر غیر محدود اور انہوں نے تسلیم کیا کہ اللہ تعالیٰ اَلْعَلِیْمُ اور اَلْحَکِیْمُ ہے یعنے اس کا علم کامل ہے اور اس کا کوئی فعل بلا حکمت نہیں ہوتا۔

آیت ہذا میں فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی صفات العلیم اور الحکیم بیان کرنے کا مطلب۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے تو یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ علیم ہے یہ تو نتیجہ نہ نکلا کہ انسان بھی کوئی ذاتی خوبی رکھتا ہے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کے رو سے اور یہی حقیقت بھی ہے حقیقی طور پر ذاتی خوبی تو خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی وجود میں ہے ہی نہیں۔ اور فرشتوں نے اپنے پہلے اظہار خیال میں ہی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کیونکہ انہوں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ پس یہ سوال تو زیر بحث ہی نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ کو علم کامل حاصل ہے یا نہیں سوال یہ تھا کہ آیا انسانی پیدائش کی کوئی غرض ہے یا نہیں اور اسی کا جواب آدمؑ کو صفاتِ الٰہیہ کا علم دیکر دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کو سیکھنے کی قابلیت جس قدر ایسے وجود میں پائی جاتی ہے جو خیر و شر دونوں کی مقدرت رکھتا ہو وہ قابلیت ان وجودوں میں نہیں ہو سکتی جو صرف خیر کا ہی مادہ رکھتے ہوں اور شر کو اختیار کرنے کی مقدرت ان میں نہ ہو فرشتوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور عَلِیْمُ کے ساتھ حَکِیْمُ کا لفظ لگا کر اقرار کیا کہ خدا تعالیٰ کی صفت علیم کا کامل مظہر وہ نہیں ہو سکتے بلکہ انسان ہی ہو سکتا ہے اس لئے اس کی پیدائش خدا تعالیٰ کی صفت حکیم کے ماتحت ہے یعنی بڑی بھاری حکمت اپنے اندر رکھتی ہے۔

آدم کے واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کی غرض

جیسا کہ اوپر کی تشریحات سے ثابت ہے کہ آدم کے واقعہ کی اس تفصیل کے بیان کرنے سے پیدائش عالم کی غرض اور حکمت بتانا مقصود ہے اور یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ ہر زمانہ میں الہام الٰہی کا نزول اسی غرض کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے اور جو لوگ نبیوں کی بعثت پر معترض ہوتے ہیں وہ گویا دوسرے الفاظ میں اس امر پر معترض ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی پیدائش کی غرض کو کیوں پورا کرنے لگا ہے اور یہ اعتراض

اَنۡۢبِئۡہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَہُمۡ بِاَسۡمَآئِہِمۡ ۙ

ان (فرشتوں) کو ان (چیزوں) کے نام بتا پھر جب اس (یعنی آدم) نے ان کو ان کے نام بتائے (تو)

قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ

فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں یقیناً آسمانوں

وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ○

اور زمین کی چھپی باتیں جانتا ہوں اور میں (اسے بھی) جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور (اسے بھی) جو تم چھپاتے تھے ۳۴ع

تُبۡدُوۡنَ ان کا ایسا ہونا ہے کہ اس کی بنا پر نبوت کے سلسلہ کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔

یہ جو ملائکہ نے کہا کہ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تُو نے ہمیں سکھایا اس کا یہ مفہوم نہیں کہ جو تُو نے ہمیں سکھایا ہے اسی قدر ہمیں علم ہے کیونکہ یہ تو ایک ظاہر حقیقت ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارا علم اس طرح

تَکۡتُمُوۡنَ بڑھتا نہیں جس طرح کہ انسان کا بڑھتا ہے اور اسے اس کے بڑھانے کی مقدرت حاصل ہے اور دوسرے یہ کہ ہمارے اندر وہی طاقتیں ہیں جو تُو نے ہمارے اندر رکھی ہیں اور ان طاقتوں کے ساتھ ہم انسان کے متنوع اور جامع علوم کو نہیں پہنچ سکتے یعنی ہم یہ سمجھ گئے ہیں کہ انسان کی پیدائش میں حکمت ہے اور اس کے سپرد ایک ایسا کام ہے جو ہم بھی نہیں کر سکتے اس لئے اگر بعض انسان خونریزی کرنے والے ہوں یا خونریزی کا موجب بننے والے ہوں یا شریروں کی شرارتوں کو روکنے کے لئے جائز خونریزی پر مجبور ہوں تب بھی انسان کی پیدائش ضروری اور حکیمانہ فعل ہے۔

غَیۡبَ ۳۴ حل لغات:۔ غَیۡبَ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۴ع

اَلسَّمٰوٰت اَلسَّمٰوٰت:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ بقرہ ۲۰ع

اَلۡاَرۡض اَلۡاَرۡض:۔ کی تشریح کیلئے دیکھو حل لغات سورۂ بقرہ ۱۲ع

تُبۡدُوۡنَ:۔ اَبۡدٰی (یُبۡدِیۡ) سے مضارع جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور بَدَا (یَبۡدُوۡا) سے جو اس کا مجرد ہے بنا ہے بَدَا الۡاَمۡرُ کے معنے ہیں ظَھَرَ کوئی امر واضح اور ظاہر ہو گیا اور اَبۡدَی الۡاَمۡرَ کے معنے ہیں اَظۡھَرَہٗ کسی امر کو ظاہر کیا (اقرب) پس تُبۡدُوۡنَ کے معنے ہونگے تم ظاہر کرتے ہو۔

تَکۡتُمُوۡنَ:۔ کَتَمَ (یَکۡتُمُ کَتۡمًا وَ کِتۡمَانًا) سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے کَتَمَ الشَّیۡءَ کے معنی ہیں اَخۡفَاہُ اس کو پوشیدہ رکھا۔ بعض اوقات کَتَمَ کے دو مفعول آجاتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کَتَمَ زَیۡدًا الۡحَدِیۡثَ کہ اس نے زید سے بات کو مخفی رکھا۔ اس میں زَیۡد اور اَلۡحَدِیۡثَ دونوں کَتَمَ کے مفعول ہیں (اقرب) نیز اہل عرب کہتے ہیں کَتَمَ الۡفَرَسُ الرَّبۡوَ اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ ضَاقَ مَنۡخِرُہٗ عَنۡ نَفَسِہٖ کہ گھوڑا جب دوڑتے ہوئے ہانپ گیا اور لمبے سانس لینے لگا تو نتھنوں کے تنگ ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح سانس نہ لے سکا (اقرب) گویا جب کسی چیز کی وضع ایسی ہو کہ وہ کسی بات کے ظاہر کرنے سے قاصر ہو تو اس وقت بھی اس کے متعلق کَتَمَ کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں مفردات راغب میں امام راغب لکھتے ہیں کہ لَا یَکۡتُمُوۡنَ اللّٰہَ حَدِیۡثًا کے معنی حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ نے یہ کئے ہیں کہ ان کا اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپا

سکتا اس طور پر ہوگا کہ اُن کے جوارح تمام باتوں کو ظاہر کردینگے (مفردات) گویا آپ ہی آپ جو بات ظاہر ہو جائے وہ خلاف کتمہ ہے۔ پس جو بات آپ ہی رُکی ہوئی ہو اسپر کَتَمَ بولیں گے پس تَکْتُمُوْنَ کے دو معنے ہوئے (۱) جو تم چھپاتے ہو (۲) جو تم سے ظاہر نہیں ہو سکتا ہے جو چیز باہر آنی تھی وہ بسبب ناقابلیت کے نہیں آسکتی یعنی تمہاری خلقت ایسی ہے کہ تم سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

تفسیر گو فرشتوں نے اجمالی طور پر انسانی پیدائش کی غرض کو سمجھ لیا تھا مگر دلیل کو مکمل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آدم کو حکم دیا کہ وہ ان کا ملین کے خواص اور خصائص کو جو اس کی امت میں ہونے والے تھے یا اس کی نسل میں ہونے والے تھے بیان کرے تاکہ وہ حقیقت جو علمی طور پر ظاہر تھی عملی طور پر بھی ظاہر ہو جائے۔

اس سے یہ مُراد نہیں کہ فرشتوں یا آدم میں واقعی کوئی ایسا مکالمہ ہُوا بلکہ عربی محاورہ کے مطابق ایک حقیقت جو ظاہر کی جائے اُسے مکالمہ کا رنگ دے دیا جاتا ہے عربی زبان کا شاعر راجز کہتا ہے اِمْتَلَاَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِیْ حوض بھر گیا اور اس نے کہا کہ بس بس میں بھر گیا ہوں اس سے یہ مراد نہیں کہ حوض بھر گیا تو چیخ اُٹھا کہ بس کرو بلکہ مراد یہ ہے کہ حوض نے بزبان حال ایسا کہا (فقہ اللغۃ للثعالبی جلد دوم ص۲۳۷) اسی طرح ایک اور عرب شاعر کہتا ہے ؎

قَالَتْ لَهُ الْعَيْنَانِ سَمْعًا وَطَاعَةً (لسان)

آنکھوں نے اس سے کہا کہ ہم نے آپ کی بات سُنی اور ہم فرمانبرداری کرینگی۔ دوسری زبانوں میں بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے اُردو کے مشہور شاعر جلال الدین لکھنوی جن سے بچپن میں مَیں نے بھی اصلاح لی تھی کہتے ہیں ؎

حکم دل کا ہے لئی آکے بجھاؤ میری
عرض کرتے ہیں یہ آنسو کہ جناب آنکھوں سے

اس شعر کا بھی یہی مطلب ہے کہ دل کے درد کا نتیجہ آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا ہے پس کبھی قول کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور مُراد صرف یہ ہوتی ہے کہ زبانِ حال سے یہ امر ظاہر ہُوا اسی طرح اس جگہ یہ ضروری نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے ایسا کہا ہو بلکہ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت آدم علیہ السلام نے ان صفاتِ الٰہیہ کا اظہار کرنا شروع کیا جو ان کی نسل سے ظاہر ہونے والی تھیں اور اس طرح عملی طور پر ملائکہ پر انسان کی رُوحانی ترقیات کی حقیقت کھُل گئی اور آدم علیہ السلام کو تعلیم دینے کے بھی یہ معنی نہیں کہ بالمشافہ بٹھا کر درس دیا گیا تھا بلکہ الہام جلی یا خفی دونوں میں سے کسی ایک کے ذریعہ سے یا دونوں سے انہیں صفاتِ الٰہیہ اور لغت اور خواص اشیاء کا علم بخشا گیا فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ یعنی جب آدم علیہ السلام نے ان کمالات کو ظاہر کرنا شروع کیا جو ان کی اُمّت سے عام طور پر اور انکی نسل کے کاملین سے خاص طور پر ظاہر ہونے والے تھے تو ملائکہ کو معلوم ہو گیا کہ جس رنگ میں صفاتِ الٰہیہ کو انسان ظاہر کرنے والا ہے اور کوئی وجود ظاہر نہیں کرسکتا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ اس میں پہلی آیت کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے کہ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اور اسی مضمون کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ زمین کی ضرورتوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے اور آسمانی فضل کی بارشیں جس طرح زمین پر نازل ہونا چاہتی ہیں اور اس کی صفات کا جو تقاضا ہے اسے بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔

فرشتوں کے ظاہر کرنے اور چھپانے کا مطلب۔

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ سے یہ مراد نہیں کہ فرشتوں کے دلوں میں کوئی ایسا اعتراض تھا جسے وہ چھپاتے تھے اور منہ سے کچھ اور کہتے تھے کیونکہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے فرشتے گناہ سے پاک ہیں وہ اس قسم کا فعل کر ہی نہیں سکتے اس جملہ کا صرف یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان قوتوں کا بھی علم ہے جو فرشتوں سے ظاہر ہوتی ہیں اور ان کا بھی جو انکے ذریعہ سے ظاہر نہیں ہو سکتیں جعل لغات میں

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو۔ اسپر انہوں نے تو فرمانبرداری کی مگر

اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ابلیس (نے نہ کی۔ ابلیس) نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا ۳۵

کَتَمَ کے معنوں میں بتایا جا چکا ہے کہ کَتَمَ کے معنے کبھی روک بننے اور معذور ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور یہی معنے اس جگہ چسپاں ہوتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ کس حد تک تم صفاتِ الٰہیہ کو ظاہر کرنے پر قادر ہو اور کس حد تک ان کے اظہار سے قاصر ہو اس لئے میری صفات کاملہ نے چاہا کہ وہ ایک ایسا وجود بھی کھڑا کرے جو خدا تعالیٰ کی تمام صفات کو ظاہر کر سکنے کی مقدرت رکھتا ہو۔

قُلْنَا

۳۵ حل لغات:- قُلْنَا۔ قَالَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے اور قَالَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۳۱

اُسْجُدُوْا

اُسْجُدُوْا۔ امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَلسُّجُوْدُ جو (سَجَدَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَلتَّذَلُّلُ عاجزی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا۔ وَقَوْلُهٗ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ قِيْلَ اُمِرُوْا بِالتَّذَلُّلِ لَهٗ وَالْقِيَامِ بِمَصَالِحِهٖ وَمَصَالِحِ اَوْلَادِهٖ یعنی آیت اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ الخ میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آدم کی فرمانبرداری کریں اور اس کے ماتحت چلیں (یعنی اصلاح کا وہ کام جو آدم دنیا میں کرینگے اس میں اسکی مدد کریں اور اس کی قبولیت لوگوں میں پھیلائیں) اور اسکی مدد کریں اور اس کی اولاد کے لئے مدد اور معاون بنیں اَوِ اسْجُدُوْا لِاَجْلِ خَلْقِ اٰدَمَ نیز اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آدم کی پیدائش کی وجہ سے اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤ۔ وَقَوْلُهٗ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اى مُتَذَلِّلِيْنَ مُنْقَادِيْنَ اور قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ تم اس دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ تم فرمانبرداری کرتے ہوئے

اِلَّآ

جاؤ (مفردات) سَجَدَ (یَسْجُدُ) سُجُوْدًا کے معنی ہیں خَضَعَ وَاِنْحَنٰى اس نے عاجزی کی اور عجز کا اظہار جھکنے سے کیا سَجَدَ الْبَعِيْرُ۔ خَفَضَ رَأْسَهٗ اونٹ نے اپنا سر نیچا کیا۔ سَجَدَتِ السَّفِيْنَةُ الرِّيَاحَ اَطَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا کشتی نے ہوا کی پیروی کی۔ اور جدھر کو ہوا اسے لے گئی اُدھر جھک پڑی۔ اہل عرب کہتے ہیں فُلَانٌ سَاجِدُ الْمِنْخَرِ اور مراد یہ ہوتی ہے ذَلِيْلٌ خَاضِعٌ کہ فلاں شخص مطیع ہے اور عاجزی کرنے والا ہے (اقرب) پس اُسْجُدُوْا کے معنے ہونگے اطاعت و فرمانبرداری کرو۔

اِلَّآ۔ حرف استثناء ہے اور اپنے مابعد اسم کو اکثر نصب دیتا ہے۔ استثناء دو قسم ہوتا ہے (۱) متصل جیسے جَاءَ فِي الْقَوْمُ اِلَّا زَيْدًا یعنی زید کے سوا باقی سب لوگ میرے پاس آئے (۲) منقطع جیسے مَا جَاءَ فِي الْقَوْمُ اِلَّا حِمَارًا یعنی لوگ تو میرے پاس نہیں آئے مگر گدھا آیا۔

اِبْلِيْسَ

اِبْلِيْس:- اِبْلِيْس اَبْلَسَ سے بنا ہے اور اَبْلَسَ کے معنے ہیں قَلَّ خَيْرُهٗ اس سے کسی بھلائی کی توقع کم ہو گئی یعنی بے خیر ہو گیا۔ اِنْكَسَرَ وَحَزِنَ شکستہ خاطر ہو گیا۔ غمگین ہو گیا اور جب اَبْلَسَ مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ کہیں تو اس کے یہ معنے ہونگے یَئِسَ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا (ان معنوں میں لازم معنے کے علاوہ متعدی معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہتے ہیں اَبْلَسَهٗ غَيْرُهٗ اس کو کسی نے نا امید اور مایوس کر دیا) اور اَبْلَسَ

فِیْ اَمْرِہٖ کے معنے ہیں تَحَیَّرَ وہ اپنے معاملہ کے بارہ میں حیرانگی میں پڑ گیا۔ اَبْلَسَ فُلَانٌ کے ایک معنے سَکَتَ غَمًّا کے بھی ہیں یعنی غم و اندوہ کی وجہ سے خاموش ہو گیا (اقرب) پس اِبْلِیْس کے معنے ہونگے (۱) ایسی ہستی جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گئی (۲) ایسی ہستی جس سے بھلائی کی امید کم ہو (۳) ایسی ہستی جو اپنے معاملہ میں حیران رہ گئی ہو کہ اُسے کیا کرنا چاہئے (۴) ایسی ہستی جو غم و اندوہ سے بھری رہے۔

اَبٰی:- اَبَاہُ اِبَاءً وَ اِبَاءَۃً کے معنے ہیں لَمْ یَرْضَہٗ اس کو پسند نہ کیا (اقرب) امام راغب اپنی کتاب مفردات راغب میں لکھتے ہیں کہ اَلْاِبَاءُ کے معنی ہیں شِدَّۃُ الْاِمْتِنَاعِ کسی امر سے سختی سے رُکنا (ہر امتناع کو اِبَاء نہیں کہیں گے) (مفردات) مصنف تاج العروس لکھتے ہیں اَبَاہُ کَرِھَہٗ کہ اَبٰی کے معنے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں نیز لکھا ہے کہ اَلْاِبَاءُ:- ھُوَ الْاِمْتِنَاعُ عَنِ الشَّیْءِ وَالْکَرَاھِیَۃُ لَہٗ بِبُغْضِہٖ وَعَدَمِ مُلَایَمَتِہٖ کسی چیز کو ردّی اور اپنے مناسب حال نہ سمجھ کر اس سے انکار کر دینا اور اس سے نفرت کرنا اِبَاءٌ کہلاتا ہے (تاج)

اِسْتَکْبَرَ:- اِسْتَکْبَرَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں رَاٰہُ کَبِیْرًا وَعَظُمَ عِنْدَہٗ کسی چیز کو بڑا سمجھا نیز اِسْتَکْبَرَ کے معنے ہیں کَانَ ذَا کِبْرِیَاءٍ بڑا بنا۔ مغرور ہوا (اقرب) مفردات میں لکھا ہے۔ اَلْکِبْرُ:- اَلْحَالَۃُ الَّتِیْ یَتَخَصَّصُ بِھَا الْاِنْسَانُ مِنْ اِعْجَابِہٖ بِنَفْسِہٖ وَذٰلِکَ اَنْ یَّرَی الْاِنْسَانُ نَفْسَہٗ اَکْبَرَ مِنْ غَیْرِہٖ کہ کِبْر اس حالت کو کہتے ہیں کہ جب انسان خود پسند بن کر کسی بات کو اپنے ساتھ مخصوص سمجھ لیتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز اور بڑا خیال کرنے لگ جاتا ہے وَالْاِسْتِکْبَارُ یُقَالُ عَلٰی وَجْھَیْنِ اور اِسْتِکْبَار (اپنے آپ کو بڑا سمجھنا) دو طور پر ہوتا ہے (۱) اَنْ یَّتَحَرَّی الْاِنْسَانُ وَیَطْلُبَ اَنْ یَّصِیْرَ کَبِیْرًا کہ انسان بڑا بننے کی خواہش اور کوشش کرتا ہے (اور یہ اگر مناسب محل و مقام پر کوشش کی جائے تو قابلِ تعریف بات ہوتی ہے) (۲) اَنْ یَّتَشَبَّعَ فَیُظْھِرَ مِنْ نَفْسِہٖ مَا لَیْسَ لَہٗ کہ کوئی شخص بعض ایسی باتوں کے ساتھ اپنے نفس کو متصف کرے جو اس میں پائی نہیں جاتیں اور مقصد یہ ہو کہ وہ کسی طرح دوسروں پر فوقیت لے جائے (مفردات)

کَانَ:- کَانَ افعال ناقصہ میں سے ہے یہ مبتدا اور خبر پر داخل ہو کر مبتدا کو رفع اور خبر کو نصب دیتا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ایک فعل گزشتہ زمانے میں سرزد ہو کر ختم ہو گیا۔ بعض اوقات اس کے معنے صرف کسی بات کے حدوث اور وقوع کے ہوتے ہیں اس وقت اس کی خبر نہیں آتی۔ چنانچہ کہہ دیتے ہیں کَانَ الْاَمْرُ کہ فلاں کام ہو چکا۔ علاوہ ازیں یہ کئی اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک معنی صَارَ کے ہیں یعنی ہو گیا (اقرب) چنانچہ کَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ میں کَانَ کے معنی صَارَ کے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ اور یہ بھی کہ کافروں میں سے تھا۔ — کَانَ — اَبٰی

اَلْکٰفِرِیْنَ:- کفر سے اسم فاعل کَافِرٌ آتا ہے اور کَافِرُوْنَ اور کَافِرِیْنَ اس کی جمع ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ع ۱ — اَلْکٰفِرِیْن — اِسْتَکْبَرَ

تفسیر:- پیشتر اس کے کہ اس آیت کی مجموعی تفسیر بتائی جائے یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ اس آیت میں سجدہ کرنے سے کیا مراد ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (سورہ حٰمٓ سجدہ ع ۵) یعنی نہ تو سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ صرف اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے پس اس حکم کے ہوتے ہوئے کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں بعض لوگ اس پر کہہ دیا کرتے ہیں کہ شائد آدم کے وقت میں سجدہ غیر اللہ کے لئے جائز ہوگا بعد میں منع ہوا لیکن یہ خیال — آیت وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا میں سجدہ کرنے سے مراد۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا امتناع۔

درست نہیں کیونکہ توحید پر قائم رہنے کا حکم ایک دائمی حکم ہے وقتی حکم نہیں کہ مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہو۔ علاوہ ازیں فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ (اعراف ع ۲۴) وہ ہستیاں جو اللہ تعالیٰ کے قرب میں رہتی ہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بڑا نہیں سمجھتیں اور اس سے جی نہیں چراتیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی رہتی ہیں اور صرف اس کے سامنے سجدہ کرتی ہیں

آدم کو سجدہ کرنے کے حکم سے مراد خلافتِ آدم کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ملائکہ کا ہمیشہ یہ طریق ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے سجدہ کرتے ہیں اور کسی کے آگے سجدہ نہیں کرتے۔ پس جب ملائکہ اور ملائکہ کے نقش قدم پر چلنے والے وجودوں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ کبھی بھی خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے تو یہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیکر ملائکہ سے غیر اللہ کو سجدہ کروایا اور انہوں نے سجدہ کیا۔

فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا مطلب۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا قرآنی تعلیم کے خلاف ہے اور یہ بھی کہ ملائکہ نے کبھی بھی کسی غیر اللہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا تو اب یہ سوال رہ گیا کہ اس آیت میں سجدہ کے حکم سے کیا مُراد ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ (۱) عربی زبان میں گو کبھی لام سَجَدَ کے بعد اس کے معنوں کو تقویت دینے کے لئے بھی آتا ہے اور اس وقت اس کے معنے اس چیز کو سجدہ کرنے کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ (حٰمٓ سجدہ ع ۵) یعنی اللہ کو سجدہ کرو لیکن کبھی لام عام صلہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت اس کے اپنے مستقل معنے ہوتے ہیں اور وہ معنے علت اور سبب کے ہیں چنانچہ عرب کا مشہور شاعر امرؤ القیس کہتا ہے ؎

وَیَوْمَ عَقَرْتُ لِلْعَذَارٰی مَطِیَّتِیْ (سبع معلقات)

اور یاد کرو اس دن کو جبکہ میں نے کنواری عورتوں کی خاطر اپنی سواری کی اونٹنی ذبح کر دی تھی اس جگہ لام تعدیہ کی تقویت کے لئے نہیں آیا بلکہ مستقل معنے دیتا ہے اور وہ سبب اور علت کے معنے ہیں اور مُراد یہ ہے کہ میرے اونٹنی ذبح کرنے کا سبب کنواری لڑکیوں کی دلستگی کا حصول تھا اسی طرح اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے معنے یہ نہیں کہ آدم کو سجدہ کرو بلکہ یہ معنی ہیں کہ آدم کے خلیفہ بننے کے سبب سے خدا تعالیٰ کو سجدہ کرو کہ اس نے ایک ایسے اچھے نظام کو قائم کیا۔ گویا جب اللہ تعالیٰ نے دلائل اور مشاہدات سے فرشتوں پر ثابت کر دیا کہ آدم کی خلافت اللہ تعالیٰ کے پُر حکمت افعال میں سے ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نیا اور کامل ظہور وابستہ ہے تو اس نے ملائکہ کو کہا کہ اس خوشی میں اب تم میرے حضور سجداتِ شکر بجا لاؤ یہ حکم ویسا ہی ہے جیسے خدا پرست لوگوں کو جب کوئی خدا تعالیٰ کی قدرت نظر آتی ہے تو وہ سجدہ میں گر جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ آدم کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ خلافتِ آدم کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ آدم کی وجہ سے یعنی اس کے مقامِ خلافت پر فائز ہونے کی وجہ سے سجدہ کرو۔ سجدہ کیسے کرو اس کے اظہار کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سجدہ سوا خدا تعالیٰ کے کسی کو جائز ہی نہیں۔

ان معنوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مومن کو یہ سبق ملتا ہے کہ جب کوئی فضل خدا تعالیٰ کا نازل ہوا سے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر جانا چاہیئے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے مزید فضل نازل ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ بہت سے لوگ انعامات کے حصول پر بجائے خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے مغرور ہو جاتے ہیں اور اپنی ترقیوں کو اپنے ہُنر اور اپنے کمال کی طرف منسوب کرنے لگ جاتے ہیں۔

(۲) دوسرے معنے سجدہ کرنے کے یہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہیں کہ آدم کی فرمانبرداری اور اطاعت کرو جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے سجدہ کے معنے علاوہ جسمانی سجدہ کے فرمانبرداری اور اطاعت کے بھی ہیں چنانچہ راغب لکھتے ہیں اَلسُّجُوْدُ: اَلتَّذَلُّلُ سجدہ کے معنے فرمانبرداری اور عاجزی کے بھی ہیں حل لغات میں راغب کا یہ قول لکھا جا چکا ہے کہ بعض آئمہ نے اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ اُمِرُوْا بِالتَّذَلُّلِ

لَہٗ ذَا الْقِیَامِ بِمَصَالِحِہٖ وَمَصَالِحِ اَوْلَادِہٖ یعنی ملائکہ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ آدم کی فرمانبرداری کریں اور اس کی مصلحتوں اور اس کے ارادوں اور اس کی اولاد کے ارادوں اور خواہشوں کے پورا کرنے میں لگ جائیں۔

ان معنوں کی رُو سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلعتِ خلافت بخشا تو ملائکہ کو حکم دیا کہ اب یہ دُنیا پر ہماری مرضی ظاہر کرنے والا ہے تم کو بھی چاہیئے کہ جو کام یہ کرے اس کی امداد کرو اور اس کی تائید میں اس نظام کو لگا دو جو تمہارے ماتحت ہے اور جس کی تم ابتدائی کڑیاں ہو چنانچہ فرماتا ہے فَسَجَدُوْا اسپر وہ سب کے سب آدم کی تائید میں لگ گئے اور اس کے ارادوں کو پورا کرنے کی کوششوں میں منہمک ہو گئے۔

اِلَّا اِبْلِیْسَ۔ یعنی ملائکہ نے تو حکمِ الٰہی کے ماتحت سجدہ کر دیا۔ مگر ابلیس نے نہ کیا۔ ابلیس کون تھا اس کا تفصیلی جواب آگے آئے گا مگر یہ امر سمجھ لینا چاہیئے کہ بہرحال وہ فرشتوں میں سے نہ تھا۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ (کہف ع ۷) وہ جنوں میں سے تھا پس اپنی جبلت کے مطابق اس نے فرمانبرداری سے انکار کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا تو اِلَّا کا لفظ کیوں یہاں استعمال ہوا ہے کیونکہ اِلَّا کے معنے سوائے کے ہیں۔ اور سوائے کے لفظ سے تو انہی اشیاء کا استثناء کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے کی مذکورہ چیزوں میں سے ہوں مثلاً جب یہ کہیں کہ سب دوست آگئے سوائے زید کے تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ زید ہمارے دوستوں میں سے ہے پس اس آیت میں بھی سوائے ابلیس کے الفاظ کے یہی معنے ہو سکتے ہیں کہ ابلیس بھی فرشتوں میں سے تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اِلَّا کے معنے سوائے کے ہیں اور بالعموم اِلَّا کے بعد جس وجود کا ذکر ہو وہ اِلَّا کے پہلے کے بیان کردہ گروہ کی جنس میں تو شریک ہوتا ہے مگر اس خاص فعل میں جس کا پہلے ذکر ہوا ہو اس سے مختلف ہوتا ہے جیسا کہ اوپر کی مثال میں ہے کہ 'سوائے' سے پہلے جن دوستوں کا ذکر ہے ان میں تو زید شامل ہے لیکن آنے کے فعل میں ان کا شریک نہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اِلَّا کے بعد مذکور وجود اِلَّا سے پہلے کے مذکورہ گروہ سے الگ ہوتا ہے اور جب ایسا ہو تو عربی میں اس اِلَّا کو منقطع کہتے ہیں یعنی اس کے بعد جس وجود کا ذکر ہے وہ نہ صرف یہ کہ پہلے بیان کردہ فعل میں ان کا شریک نہیں بلکہ اس فعل کے مرتکب لوگوں کا بھی جزو نہیں اس کی مثال میں علماءِ نحو کا یہ مشہور فقرہ ہے کہ جَاءَ الْقَوْمُ اِلَّا حِمَارَهُمْ یعنی قوم تو آگئی مگر ان کا گدھا نہیں آیا اس استعمال کے موقعہ پر اُردو زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے سوائے کا لفظ استعمال نہ کیا جائے گا بلکہ 'مگر' کا لفظ استعمال کیا جائے گا کیونکہ اُردو زبان میں سوائے کا لفظ وہی معنے دیتا ہے جن میں اِلَّا کے بعد کا مذکور اس سے پہلے کے مذکور کا حصہ ہو اور وہ دوسرے معنے اِلَّا کے جو اوپر بیان ہوئے ہیں سوائے کے لفظ سے ادا نہیں ہوتے ان دوسرے معنوں کے ادا کرنے کے لئے 'مگر' کا لفظ زیادہ مناسب اور ٹھیک ہوتا ہے۔

فرشتوں کو آدم کو سجدہ کرنے کے حکم سے مراد آدم کی فرمانبرداری کا حکم۔

حقیقتِ ابلیس میں اِلَّا استثناء منقطع کے لئے ہے

خلاصہ یہ کہ اس جگہ اِلَّا منقطع ہے اور اس کے معنے 'سوائے' کے نہیں بلکہ 'مگر' کے ہیں۔ ان معنوں پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تو پھر ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے اور ان کے فرمانبرداری کرنے کے ذکر میں ابلیس کا ذکر کیوں کیا گیا ہے جب اسے حکم ہی نہ دیا گیا تھا تو پھر اس نے سجدہ کرنا ہی کیوں تھا مگر یہ اعتراض ملائکہ کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے پہلی آیات میں بتایا جا چکا ہے کہ ملائکہ اس نظامِ عالم کے مدبّر ہیں چنانچہ قرآن کریم میں انھیں مختلف امور کی پہلی کڑی اور سبب اولیٰ بتایا گیا ہے اور سورۂ نازعات میں ان کی نسبت آتا ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا ہم شہادت کے طور پر ان ارواح کو پیش کرتے ہیں جو کارخانۂ عالم کو چلاتی ہیں پس جب ملائکہ کارخانۂ عالم کو چلانے والے اور پہلی علت ہیں تو جو انھیں دیا جائیگا وہ ان کے لئے ہی نہ ہوگا بلکہ ان افراد کے لئے بھی ہوگا جو ان کے تابع ہیں چنانچہ اس حدیث میں جو پہلے بیان ہو

چکی ہے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کی قبولیت دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے تو جبریل سے کہتا ہے اور جبریل دوسرے ملائکہ سے۔ اور پھر ملائکہ سے یہ بات عالم سفلی میں اُتر آتی ہے اور اس شخص کی قبولیت انسانوں میں پھیل جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کارخانۂ عالم ایک زنجیر کی طرح ہے اور اس کی پہلی کڑی ملائکہ ہیں اور جو زنجیر کی پہلی کڑی کو ہلائے

ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے میں ابلیس کا ذکر

اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کے ہلنے سے بعد کی کڑیاں بھی حرکت کریں اسی طرح جب اللہ تعالیٰ ملائکہ کو کوئی حکم دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عالمِ دُنیاوی میں اس قسم کی تحریک شروع ہو جائے جب ملائکہ کو آدم کی فرمانبرداری کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تو اس کا بھی یہی مطلب تھا ملائکہ تو پہلے مخاطب تھے لیکن حکم سب دُنیا کے لئے تھا پس جس نے اس حکم کا انکار کیا نافرمان ٹھہرا۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ اس کی نسبت فرماتا ہے کہ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ (اعراف ع۲) جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس امر نے روکا اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ کے حکم میں سب کے لئے حکم شامل تھا اور ابلیس بھی اس کا ویسا ہی پابند تھا جیسا کہ اور مخلوق۔ پس ابلیس کی نافرمانی کا ذکر یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ ملائکہ میں سے تھا بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس نے ملائکہ کی تحریک کا انکار کیا اور خدا تعالیٰ کے حکم کو جسے فرشتوں نے آگے چلایا قبول نہ کیا أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ۔ اس جملہ میں ملائکہ کی تحریک کے انکار کے چار اسباب بیان فرمائے ہیں (۱) اوّل اِبا۔ اِبَاء کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتائے جا چکے ہیں ایسی چیز کے ردّ

ملائکہ کی تحریک کے انکار کے چار سبب

کرنے کے ہیں جسے انسان ناقص اور اپنے مناسب حال نہ سمجھتے ہوئے ردّ کر دے۔ پس أَبَىٰ کے معنے ہوئے کہ ابلیس نے اس تحریک کو اپنے مناسب حال نہ سمجھا اور ناقص خیال کیا اور اس وجہ سے اسے نفرت کرتے ہوئے ٹھکرا دیا۔ سچائیوں کے انکار کا یہ ایک بہت بڑا سبب ہوتا ہے لوگ سچائی کو اس نظر سے نہیں دیکھتے کہ ان سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچے گا بلکہ اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ ان کے قریب کے مصالح پر ان کا کیا اثر پڑیگا اور جب ان کے قریب کے مصالح پر بُرا اثر پڑتا ہے تو وہ اپنے انجام کو اور دنیا کے فوائد کو بھلا دیتے ہیں اور سچائی کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں (۲) دوسری وجہ اِسْتَكْبَرَ کے ان معنوں سے بتائی ہے جو تکبّر کرنے کے ہیں۔ ابلیس نے اس وجہ سے آدم کی فرمانبرداری سے انکار کیا۔ کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا اور آدم کی اطاعت میں اپنی بڑائی کے کھوئے جانے کا خطرہ محسوس کرتا تھا قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے کہ ابلیس نے آدم کی فرمانبرداری سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ (اعراف ع۲ و ص ع۵) میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تُو نے اسے تو پانی ملی ہوئی مٹی سے بنایا ہے اور مجھے آگ سے بنایا ہے یعنی یہ تو گیلی مٹی کی طرح غلامانہ فطرت رکھتا ہے جس سانچے میں چاہو اسے ڈھال لو۔ مگر میں تو آگ ہوں کسی کی بات مان نہیں سکتا۔ آزاد مزاج رکھتا ہوں۔ ایسے غلام مزاج والے کی فرمانبرداری کس طرح کر سکتا ہوں۔

صداقت کے انکار کی یہ دوسری وجہ بھی عام ہے صداقت کے ساتھ جو انکسار اور فروتنی انسان کی طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہے اسے صداقت کے دشمن حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مُلک وقت کے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں اور ایسے لوگوں کو قوم کا دشمن اور مُلک کا غدار خیال کرتے ہیں اور اپنی شورش پسند اور شریر طبیعت پر فخر کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس جارحانہ عادت سے وہ ملک اور قوم کو اعلیٰ مقام پر لے جائیں گے اور یہ خیال نہیں کرتے کہ حقیقی ترقی استقلال اور قربانی اور پابندی نظام سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ شورش اور فساد سے کہ وہ عارضی طور پر جاذب توجہ ہوتا ہے مستقل فوائد کا موجب نہیں ہو سکتا۔

استکبار کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے اصل روک یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی

سرداری کھوئے جانے سے ڈرتے ہیں۔ قوم کا فائدہ اور دُنیا کا نفع ان کے سامنے نہیں ہوتا۔

(۳) تیسری وجہ استکبار کے ان معنوں سے بتائی ہے جو بڑا سمجھنے کے ہیں جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے استکبار کے ایک معنی تکبّر اور خود پسندی ہیں اور دوسرے کسی چیز کو بڑا سمجھنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے فرماتا ہے وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا (فرقان ع ۳) یعنی جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعاوی کو سُن کر کہا کہ اگر فرشتے اُترتے ہیں تو ہم پر کیوں نہیں اُترتے اور اگر خدا تعالیٰ کو کوئی دیکھ سکتا ہے تو ہمیں خدا تعالیٰ کیوں نظر نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ یہ اپنے دلوں میں ان دونوں باتوں کو بہت بڑا اور ناممکن سمجھتے ہیں اور شرارتوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔

یہ تیسری وجہ بھی صداقتوں کے انکار میں بہت بڑا دخل رکھتی ہے مُدّت سے تو مخالف یہ کہتے ہیں کہ انبیاء جھوٹ بول رہے اور قوم کے دشمن ہیں لیکن اپنے دلوں میں یہ خیال کرتے ہیں کہ قوم کو جس مقام تک پہنچانے کے وہ مدعی ہیں اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا گویا بظاہر مخالفت کی وجہ تو قوم سے غداری بیان کرتے ہیں اور بہ باطن ان کے دعووں کو ناقابل حصول سمجھتے ہیں اور اس مایوسی کی وجہ سے ان قربانیوں کے لئے جو ان کے ساتھ مل کر کرنی پڑتی ہیں اپنے نفوس میں جرأت نہیں پاتے۔

(۴) چوتھی وجہ جو ابلیس کے انکار کا سبب ہوئی یہ بیان فرمائی ہے کہ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ابلیس پہلے سے منکروں میں شامل تھا یعنی صداقتوں کے انکار کی اسے عادت تھی یہ وجہ بھی اکثر لوگوں کو صداقت کے قبول کرنے میں روک بنتی ہے وہ اچھے اخلاق نہ رکھنے کی وجہ سے اچھی باتوں کا انکار کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور کمزوری اور بزدلی اور اچھی باتوں کے ترک کرنے کی عادت کی وجہ سے جب صداقت ان پر کھل بھی جاتی ہے اسے قبول کرنے کی جرأت نہیں کرتے ایسے ہزاروں لوگ ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں کہ صداقت تو ان پر کھل جاتی ہے لیکن جس طرح عنکبوت اپنے گرد خود ایک جالا تن کر اس میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ بھی سچائیوں کے انکار کا ایک ایسا جالا اپنے گرد تن چکے ہوتے ہیں کہ باوجود صداقت کا علم ہو جانے کے اسے قبول کرنے کی جرأت اور توفیق نہیں پاتے۔ ابلیس میں یہ چاروں عیب جمع تھے وہ آدم کی تعلیم کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتا تھا وہ آدم سے اپنے آپ کو دنیوی وجاہت میں بڑا سمجھتا تھا اور اس کی اطاعت اسپر گراں گزرتی تھی وہ آدم کے مُلہم نظر کو ناقابلِ حصول سمجھتا تھا اور اس کے دعاوی کو ایک ہوائی قلعہ خیال کرتا تھا وہ اس کے بیان کردہ عقائد کا ایک حد تک قائل تھا لیکن جھوٹ سے ملوث زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کا قبول کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ اس کا دل اپنے سابق اعمال کے جال میں پھنس رہا تھا آج بھی صداقتوں کے منکروں کی یہی حالت ہے کاش لوگ ان چاروں عیبوں سے پاک ہو کر صداقتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ اس وقت بھی خدا تعالیٰ نے دُنیا کے لئے ترقی کا ایک وسیع دروازہ کھولا ہے اور اسلام کے غلبہ کے سامان پیدا کئے ہیں مگر تھوڑے ہیں جو اس موت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جس کے بعد انہیں بھی اور اسلام کو بھی نئی زندگی ملے گی وہ وقتی قربانیوں پر جان دیتے ہیں اور دائمی قربانی کے دینے سے کتراتے ہیں کاش ان کے دل کھل جائیں کاش ان کے دلوں کے زنگ دُھل جائیں۔

اِبْلِيْس۔ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے کہ ابلیس بَلَسَ اور اَبْلَسَ سے بنا ہے اَبْلَسَ کے معنی ہیں (۱) نیکی کا مادہ کم ہو گیا (۲) ہمت ٹوٹ گئی اور غمگین ہو گیا

(۳) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوگیا (۴) حیران رہ گیا اور اسے کوئی راہ کام کی نظر نہ آئی۔ ان معنوں کے رُو سے ابلیس کے معنی ہوئے وہ ہستی جس میں نیکی کا مادہ کم ہوگیا اور بدی کی طاقتیں زیادہ ہوگئیں جس کی ہمت ٹوٹ گئی اور ناکامی کے غم نے اسے دبا لیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوگیا جس نے اپنے مقاصد کے پانے کے لئے کوئی راستہ کھلا نہ پایا اور حیران رہ گیا ان معنوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ یا تو یہ نام صفاتی طور پر کسی ایسی رُوح کو دیا گیا ہے جو اس قسم کی کیفیات اپنے اندر رکھتی ہے اور یا پھر یہ صفاتی نام کسی ایسے انسان کا ہے جس کا نام خواہ کچھ ہو مگر اس کی دلی کیفیت کے لحاظ سے وہ اس قسم کے نام پانے کا مستحق تھا اور قرآن کریم نے اسے یہ نام دیا ہے۔

ابلیس کے معنے۔

ابلیس کا نام صفاتی نام ہے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کا نام قرآن کریم میں گیارہ جگہوں میں آتا ہے (۱) یہی مقام جس کی تفسیر لکھی جارہی ہے (۲) اعراف (۳ و ۴) حجر دو دفعہ (۵) بنی اسرائیل (۶) کہف (۷) طٰہٰ (۸) شعراء (۹) سباء (۱۰ و ۱۱) صٓ۔ ان گیارہ مقامات میں سے سوائے شعراء اور سباء کے باقی سب جگہ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کے ذکر میں ابلیس کا ذکر آتا ہے باقی دو جگہوں میں آدم کے سجدہ کا ذکر نہیں۔ سورۃ شعراء میں یہ ذکر ہے کہ ابلیس کے سب تابع جہنم میں جائیں گے اور سورۃ سباء میں یہ ذکر ہے کہ سباء کی قوم نے ابلیس کے گمان کو پورا کر دیا یعنی ابلیس نے انہیں اپنا شکار سمجھا اور وہ اس کا شکار بن گئے۔

قرآن کریم میں ابلیس اور شیطان کے الفاظ کے استعمال میں ایک خاص امتیاز

بہرحال جہاں آدم کا ذکر ہے وہاں سجدہ نہ کرنے کے موقعہ پر ہر جگہ ابلیس کا لفظ استعمال ہوا اس کے مقابل پر آدم کو ورغلانے کی کوشش کا جہاں ذکر ہے وہاں ہر جگہ ہی شیطان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کسی ایک جگہ بھی ابلیس کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اس فرق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے ابلیس اور شیطان کے الفاظ کے استعمال میں ایک خاص احتیاط سے کام لیا ہے اور یہ امتیاز بتاتا ہے کہ یہ سجدہ نہ کرنے والا ابلیس اور آدم کو دُکھ میں ڈالنے کی کوشش کرنے والا شیطان دو الگ وجود ہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ آدم کو اللہ تعالےٰ نے صاف لفظوں میں فرما دیا تھا کہ ابلیس کی بات کو نہ ماننا یہ تمہارا دشمن ہے تو اس کے بعد آدم کا ابلیس کے دھوکے میں آنا سمجھ میں نہیں آتا چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں آتا ہے فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (ع۷) یعنی ہم نے ابلیس کے سجدہ سے انکار کے بعد آدم سے کہہ دیا تھا کہ یہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی یا تیرے ساتھیوں کا دشمن ہے پس ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے اور تُو تکلیف میں پڑ جائے اس واضح ارشاد کے بعد آدم علیہ السلام ابلیس کے دھوکے میں نہ آسکتے تھے سوائے اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر آمادہ ہوتے مگر قرآن کریم اس کا انکار فرماتا ہے اور فرماتا ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ ع ۶) یعنی آدم علیہ السلام سے جو غلطی ہوئی وہ بھول سے ہوئی اور ہم نے اس میں اس غلطی کے ارتکاب کے متعلق کوئی ارادہ نہیں پایا۔

ان دونوں امور کی تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ابلیس اور تھا اور وہ شیطان جس نے آدم علیہ السلام کو دھوکا دیا اور تھا۔ چونکہ آدمؑ کو ابلیس سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اس کے ظل اور نمائندہ کو ابلیس کا نمائندہ سمجھنے میں غلطی کر گئے اور اسے دوسرا وجود سمجھ کر اس کے بارہ میں انہوں نے پوری ہوشیاری سے کام نہ لیا اور اس طرح غلطی کے مرتکب ہوگئے ان معنوں کا مؤید وہ امتیاز ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ قرآن کریم نے جہاں بھی سجدہ نہ کرنے کا ذکر کیا ہے وہاں ابلیس کا لفظ استعمال کیا ہے اور اسی وجود سے آدم کو ہوشیار کیا گیا ہے اور جہاں دھوکا دینے والے کا ذکر کیا ہے وہاں اسے شیطان کے نام سے یاد کیا ہے۔

حقیقت جیسا کہ اوپر کے حوالجات سے ثابت

ہوتا ہے یہ ہے کہ ابلیس تو اس وجود کا نام رکھا گیا ہے جو فرشتوں کے مقابل پر بدی کا محرک ہے اور شیطان ایک عام نام ہے۔ اس ابلیس کو بھی شیطان کہہ سکتے ہیں اور ان تمام لوگوں کو بھی جو ابلیس کے نائب کے طور پر اور اسکے ورغلائے ہوئے اس دنیا کے پردہ پر بدیوں کی راہنمائی کرتے ہیں اور نبیوں اور ان کی تعلیم کا مقابلہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں کسی انسان کو ابلیس کے نام سے یاد نہیں کیا گیا جہاں بھی ابلیس کا ذکر ہے فرشتوں کے مقابلہ کرنے والے وجود کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوا ہے یا بدی کی محرک روح کے لئے استعمال ہوا ہے جیسا کہ سورۂ شعراء اور سورۂ سباء کے مذکورہ بالا حوالوں میں گزر چکا ہے اس کے برخلاف شیطان کا لفظ مختلف ارواحِ خبیثہ کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے اور انسانوں کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے ارواح خبیثہ کے متعلق یہ لفظ بہت دفعہ استعمال ہوا ہے اور انسانوں کے متعلق اس کا استعمال بھی بہت ہے مگر نسبتاً کم ہے اور مندرجہ ذیل مثالوں سے ثابت ہے (۱) سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (ع ۲) جب وہ اپنے شیطانوں کے ساتھ الگ جمع ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اس آیت کے الفاظ سے یہ امر واضح ہے کہ یہاں شیاطین سے مراد آئمہ کفر ہیں اور صحابہ نے بھی اس آیت میں شیاطین کے یہی معنی کئے ہیں (دیکھو نوٹ ۱۵ سورہ بقرہ) اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے کہ لوگ مومنوں سے کہتے ہیں کہ کفار بڑی تعداد میں ان پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں پھر فرماتا ہے اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ع ۱۸) یعنی یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے تم کو ڈراتا ہے پس تم کفار سے مت ڈرو بلکہ اگر مومن ہو تو مجھ سے ڈرو۔ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہاں شیطان سے مراد کفار کے وہ ایجنٹ ہیں جو مسلمانوں کو کفار سے مرعوب کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے چنانچہ سابق مفسرین نے بھی اس جگہ شیطان سے مراد نعیم بن سعود یا ابو سفیان یا عام کفار مراد لئے ہیں جو مسلمانوں کو کفار کی طاقت سے ڈراتے تھے (فتح البیان ابن کثیر) اسی طرح قرآن کریم میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ (انعام ع ۱۴) یعنی اسی طرح ہم نے ہر نبی کا دشمن انسانوں میں سے شیطانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو بنایا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

شیطان اور ابلیس ہر دو کے الگ الگ وجود۔

غرض شیطان کا لفظ قرآن کریم میں ارواح خبیثہ کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے جو دلوں میں وساوس ڈالتے ہیں اور انسانوں کے متعلق بھی استعمال ہوا ہے لیکن ابلیس کا لفظ صرف اسی ہستی کی نسبت استعمال کیا گیا ہے جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا پس ابلیس سے مراد تو وہ روح خبیثہ ہے جو فرشتوں کے مدِمقابل ہے اور دلوں میں وساوس ڈالتی ہے اور شیطان اسے بھی کہتے ہیں اور اس کے ان اظلال کو بھی جو انسانوں میں سے اس جیسے کام کرتے ہیں۔

ابلیس کو ابلیس اور شیطان یعنی دو ناموں سے یاد کئے جانے کی وجہ۔

اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو دو ناموں سے یاد کیا ہے (۱) ابلیس اور (۲) شیطان حل لغات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ابلیس کے معنے مایوس اور حیران کے ہیں اور شیطان کے معنے حق سے دور ہونے والے یا حق سے دور کرنے والے کے اور جلنے والے کے ہیں۔ پہلا نام اس وجود کا ابلیس رکھا گیا ہے اور دوسرا نام شیطان۔ اس سے یہ نفسیاتی نکتہ نکلتا ہے کہ گمراہی اور ضلالت کا تغیر جب بھی انسان میں پیدا ہوتا ہے اس کے دو مدارج ہوتے ہیں پہلے مایوسی اور حیرانی یا دوسرے لفظوں میں جہالت پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد حق سے دوری اور دوسروں کو گمراہ کرنے اور حسد کی حالت جو آگ میں جلنے کے مشابہ مرض ہے پیدا ہوتی ہے پس گناہ سے بچنے کے لئے انسان کو مایوسی اور جہالت کا مقابلہ کرنا چاہیئے اگر مایوسی اور جہالت کو دنیا سے دور کر دیا جائے تو گمراہی اور

دوسروں کو گمراہ کرنے اور حسد کا فساد بھی خود بخود دُور ہو جائے کیونکہ یہ دوسری حالت پہلی حالت کا نتیجہ ہے۔

ملائکہ اور ابلیس

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو کیوں پیدا کیا۔ کیا وہ اپنے بندوں کو خود گمراہ کرنا چاہتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خیر و شر کی مقدرت بخشی تو ساتھ ہی ملائکہ اور ابلیس اور ان کے اظلال کا وجود بھی پیدا کیا کہ ایک گروہ تو نیکی کی تحریک دلوں میں پیدا کرتا ہے اور دوسرا بدی کی تحریک پیدا کرتا ہے پھر جو شخص ملائکہ اور ان کے اظلال کی تحریک کو قبول کرتا ہے انعام کا مستحق ہوتا ہے اور جو ابلیس اور اس کی ذریت کی تحریک کو قبول کرتا ہے وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ انسان کے کامل ہونے کے لئے ضروری تھا کہ اس کے سامنے دونوں قسم کی تحریکات پیش ہوں تا وہ اپنے فیصلہ سے ایک تحریک کو قبول کرے اور اعلیٰ انعامات کا وارث ہو اگر بدی کی تحریکات اس کے راستہ میں نہ آئیں تو وہ اعلیٰ انعامات کا مستحق نہیں بن سکتا۔

کیا ابلیس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود گمراہ کرنا چاہتا ہے۔

ہاں ایک بات قرآن کریم نے واضح فرما دی ہے اور وہ یہ کہ ابلیس یا شیطان کسی کو بھی انسان پر تصرف حاصل نہیں لوگ اپنی مرضی سے ان کی اتباع کریں تو کریں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ (الحجر ع ۳) یعنی اے ابلیس میرے بندوں پر تجھے دلیل اور برہان کے ذریعہ سے غلبہ حاصل نہ ہوگا ہاں مگر جو سرکش لوگ تیرے متبع ہو جائیں گے انہیں تیری باتیں وزنی معلوم ہونگی اسی طرح سورۃ بنی اسرائیل میں بھی ابلیس کے متعلق فرمایا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا (بنی اسرائیل ع ۷) اے ابلیس تجھے میرے بندوں پر دلائل اور براہین کے ذریعہ غلبہ حاصل نہ ہوگا اور تیرا رب ان کا کارساز ہوگا۔

لوگوں کا اپنی مرضی سے ابلیس کی پیروی کرنا۔

یعنے سُلْطٰنٌ کے معنے دلیل اور برہان کے ذریعہ غلبہ کے کئے ہیں یہ معنی قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ سورۃ کہف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْہِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ (کہف ع ۲) یعنی یہ ہماری قوم ہے جس نے خدا تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود اختیار کر لئے ہیں اگر یہ سچے ہیں تو کیوں ان کے بارہ میں کوئی کھلی دلیل پیش نہیں کرتے۔ اسی طرح یہ لفظ قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی واضح دلیل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے پس ابلیس کو خدا تعالیٰ کے بندوں کے خلاف کوئی سلطان حاصل نہ ہونے کے یہی معنے ہیں کہ ابلیس کا پلہ دلیل کی وجہ سے کبھی بھاری نہ ہوگا بلکہ وہ جھوٹ اور خوف اور لالچ اور حرص کے ذریعہ سے لوگوں کو ورغلائے گا جیسا کہ فرماتا ہے وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْھُمْ بِصَوْتِکَ وَاَجْلِبْ عَلَیْہِمْ بِخَیْلِکَ وَرَجِلِکَ وَشَارِکْھُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْھُمْ ؕ وَمَا یَعِدُھُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (بنی اسرائیل ع ۷) یعنی اے ابلیس ان میں سے جس پر تیرا بس چلے اسے اپنی آواز سے خوف دلا کر یا دھوکا دیکر اپنی طرف بلا اور اپنے سواروں اور پیادوں کو ان پر چڑھا لا اور ان کے مالوں اور اولادوں میں حصہ دار بن اور ان سے جھوٹے وعدے کر اور شیطان جو وعدے بھی کرتا ہے فریب دینے کے لئے ہی کرتا ہے۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ابلیس کے ورغلانے کا طریق یہ نہیں کہ وہ کوئی معقول دلیل دیتا ہے بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ دلوں میں خوف پیدا کرتا ہے اور جھوٹے وعدے دیتا ہے پھر جو لوگ اس خوف اور جھوٹ کی وجہ سے اس کا ساتھ دیتے ہیں ان کی مدد سے ان سے کم درجہ کے خراب لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ہدایت سے محروم کر دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کے رو سے ابلیس کی تحریکات کسی دلیل پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ خوف اور جھوٹے وعدوں پر مبنی ہوتی ہیں اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ خدا تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کرکے انسان کو گمراہ کیا ہے کیونکہ گمراہی کا الزام اللہ تعالیٰ پر تب لگ سکتا تھا اگر ابلیس کی تائید میں بھی اس نے

کوئی علمی دلیل پیدا کی جاتی۔ دلیلیں سب ملائکہ کی تائید میں ہوتی ہیں پس جو لوگ ابلیس کی اتباع کرتے ہیں اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اپنے عمل کے خود ذمہ وار ہوتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے رو سے تحریکِ خیر یعنی نیکی کی تحریک کا پلہ بھاری ہوتا ہے چنانچہ اس کی پہلی دلیل تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو ملائکہ کے تابع قرار دیا ہے جو امر کہ اِلَّا اِبْلِيْسَ کے الفاظ سے ظاہر ہے سجدہ کا حکم ملائکہ کو دیا گیا تھا لیکن اس کی نافرمانی پر ابلیس کو بھی تنبیہ کی گئی ہے اور میں بتا چکا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی ہر چیز ملائکہ کے تابع رکھی گئی ہے پس جو حکم ملائکہ کو دیا گیا اس میں ابلیس شامل تھا پس اِلَّآ اِبْلِيْسَ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اصل تحریک ملکی ہے اس سے انحراف کا نام ابلیسی تحریک ہوتا ہے جس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ملائکہ کو ابلیس پر غلبہ حاصل ہے۔ دوسری دلیل اس امر کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے بار بار فطرتِ انسانی کے نیک ہونے کا اظہار فرمایا ہے ہاں بعد میں انسان خود اسے خراب کر دیتا یا اس کے والدین یا مربی اسے خراب کر دیتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس ع) یعنی ہم انسانی جان اور اس کی درستی اور تکمیل کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں اس کے مکمل بنانے کے بعد جن باتوں سے اس کے اندر خرابی پیدا ہو سکتی ہے اور جن امور سے اس میں نیکی پیدا ہو سکتی ہے ہم نے ان سے اسے خبردار کیا پس جو شخص اپنے نفس کو بیرونی اثرات سے پاک رکھتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنے نفس کو مٹی میں ملا دیتا ہے ناکام ہو جاتا ہے ان آیات سے ظاہر ہے کہ نفسِ انسانی کو پاک بنایا گیا ہے اور بُرے بھلے کی پرکھ کا مادہ اس میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد انسان کا کام صرف اس قدر ہے کہ فطرت کے مطابق چلے اگر وہ ایسا کرے اور بیرونی اثرات کو جو فطرت کے خلاف ہوں قبول نہ کرے تو وہ نیکی میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے لیکن جو ایسا نہ کرے اور فطرت کے خلاف اثرات کو قبول کر کے اپنے پاک نفس کو گندگی سے ملوث کر دے وہ ہلاک ہو جاتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان اپنی پیدائش کے لحاظ سے ملائکہ کی تحریکوں کو قبول کرنے کے قابل بنایا گیا ہے پیدائش کے وقت اس میں ابلیس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ لیکن بعد میں وہ خود ابلیس کو دعوت دے کر ہلاک ہو جاتا ہے احادیث نبی کریم میں بھی اس مضمون کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (بخاری کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین) یعنی ہر بچہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے مادہ کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اس کے بعد اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی بچہ کی فطرت میں خرابی پیدا نہیں کی۔ یہ خرابی بعد میں پیدا ہوتی ہے گویا اصل تعلق بچہ کا ملائکہ سے ہوتا ہے۔ ابلیس سے اس کا تعلق خارجی اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔

اثرِ خبیثہ کی تردید کہ ابلیس سفلی زندگی کا مظہر ہے جس میں سے گذر کر انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے

بعض حال کے مفسرین نے اس آیت میں ابلیس کی ضرورت یہ بتائی ہے کہ وہ سفلی زندگی کا مظہر ہے جس میں سے گذر کر انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے مگر یہ تشریح درست نہیں کیونکہ اگر سفلی زندگی سے مُراد جسمانی خواہشات کا پورا کرنا ہے جیسے کھانا پینا پہننا یا شہوات بہ حدِ اعتدال پورا کرنا تو اسے ابلیس سے ملنے والی زندگی نہیں کہا جا سکتا ان تقاضوں کو اللہ تعالیٰ کے انبیاء بھی پُورا کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (مومنون ع ۴) اے رسولو پاک چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو یعنی طیبات کا استعمال نیک کاموں کی توفیق دیتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ (مسند احمد بن حنبل جلد ۶) اسلام میں رہبانیت نہیں یعنی

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا

اور ہم نے (آدم سے کہا کہ) آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس میں

مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

سے جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاَزَلَّهُمَا

درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاوگے ۳۶ؐ اور (اس کے بعد یوں ہوا کہ)

اسلام طیب اشیاء کے استعمال سے خواہ کھانے پینے کے متعلق ہوں یا پہننے اوڑھنے کے متعلق ہوں یا رہنے سہنے کے متعلق ہوں منع نہیں کرتا بلکہ ضرورت کے مطابق ان اشیاء کے استعمال نہ کرنے کو گناہ قرار دیتا ہے پس جہاں تک طیبات کو حدِ اعتدال کے اندر استعمال کرنے کا سوال ہے اسلام اسے دین کا حصہ قرار دیتا ہے اور ان کے ترک کو گناہ گردانتا ہے اب اگر اس فعل کو ابلیس کے متعلق قرار دیا جائے اور سفلی زندگی کہا جائے تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ گویا خدا تعالیٰ تمام انبیاء اور مومنوں کو ابلیس اور شیطان سے تعلق پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ سفلی زندگی سے مراد حدِ اعتدال سے زیادہ ان اشیاء کا استعمال ہے تو اس صورت میں بھی مذکورہ بالا خیال غلط قرار پاتا ہے کیونکہ اس صورت میں سفلی زندگی کو اعلیٰ زندگی کے حصول کے لئے ضروری قرار دینے کے یہ معنے ہونگے کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے انسان کو کھانے پینے اور پہننے میں اسراف کرنا چاہیئے اس کے بعد اسے اعلیٰ زندگی مل سکتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ سب انبیاء اور کامل مومن خدا تعالیٰ کو پانے سے پہلے اسراف کرتے اور حدِ اعتدال سے بڑھتے ہیں اور یہ بھی بالبداہت باطل ہے پس ابلیس کی یہ تشریح کہ وہ سفلی زندگی کا مظہر ہے اور اس میں سے ہو کر خدا تعالیٰ تک پہنچا جا سکتا ہے ایک غلط عقیدہ ہے اور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

(حاشیہ: اُسْكُنْ، زَوْجُكَ، اَلْجَنَّةَ، رَغَدًا، حَيْثُ)

۳۶ؐ حل لغات

اُسْكُنْ:- واحد امر مخاطب کا صیغہ ہے اور سَكَنَ (يَسْكُنُ) سُكُوْنًا کے معنے ہیں قَرَّ کسی جگہ قرار پکڑا۔ ٹھہر گیا۔ سَكَنَ فُلَانٌ دَارَهٗ کے معنے ہیں اِسْتَوْطَنَهَا وَ اَقَامَ بِهَا وہ اپنے گھر میں قیام پذیر ہوا۔ رہ پڑا اور بس گیا (اقرب) پس اُسْكُنْ کے معنے ہونگے۔ رہو۔

زَوْجُكَ:- زَوْجٌ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۲۶ؐ

اَلْجَنَّةُ:- اَلْجَنَّةُ کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۲۶ؐ

رَغَدًا:- رَغَدَ عَيْشُهٗ رَغَدًا کے معنے ہیں طَابَ وَاتَّسَعَ اس کے لئے زندگی کے سامان وسیع طور پر اور بافراغت مہیا ہو گئے (اقرب) تاج العروس میں ہے اَلرَّغَدُ:- اَلْكَثِيْرُ الْوَاسِعُ الَّذِیْ لَا يُعْيِيْكَ مِنْ مَالٍ اَوْ مَاءٍ اَوْ عَيْشٍ اَوْ كَلَاءٍ ضروریات زندگی کا سہولت اور کثرت کے ساتھ مل جانا رغد کہلاتا ہے (تاج)

حَيْثُ:- ظرف مکان ہے یعنی یہ بتاتا ہے کہ کوئی کام کس جگہ واقع ہوا ہے جمہور علماء کے نزدیک اس کے بعد جملہ کا آنا ضروری ہے بعض اوقات اس کے ساتھ ما لگتا ہے یعنی حَيْثُ کی بجائے حَيْثُمَا کہہ دیتے ہیں اس وقت اس کے معنی

میں شرط کا مفہوم آجاتا ہے اس لئے یہ اپنے بعد دو جملوں کو جزم دیتا ہے جیسے کہ ایک شاعر کا شعر ہے ؎

حَيْثُمَا تَسْتَقِمْ يُقَدِّرْ لَكَ اللّٰهُ نَجَاحًا فِي غَابِرِ الْأَزْمَانِ

کبھی یہ کسی فعل کے وقوع کا زمانہ بتانے کے لئے آتا ہے چنانچہ اوپر کا شعر بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے (اقرب) پس حَيْثُ شِئْتُمَا کے معنی ہونگے جہاں سے چاہو (۲) جب چاہو۔

اَلظّٰلِمِيْنَ :۔ ظَلَمَ سے اسم فاعل ظَالِمٌ آتا ہے اور اَلظّٰلِمُوْنَ اور اَلظَّالِمِيْنَ اس کی جمع ہیں ظَلَمَ فُلَانٌ ظُلْمًا وَظَلْمًا کے معنے ہیں وَضَعَ الشَّيْءَ فِيْ غَيْرِ مَوْضِعِهٖ کسی چیز کا بے محل اور بے موقع استعمال کیا نیز ظَلَمَ فُلَانًا کے معنے ہیں فَعَلَ لَهُ الظُّلْمَ اس پر ظلم کیا۔ ظَلَمَ فُلَانٌ حَقَّهٗ ۔ نَقَصَهٗ اِيَّاهُ اس کو اس کا حق پورا نہ دیا (اقرب) نیز حد سے بڑھ جانے اور دوسرے کی ملکیت پر دست درازی کرنے کو بھی ظلم کہتے ہیں (اقرب) مفردات میں ہے کہ ظلم کی تین قسمیں ہیں (۱) ظُلْمٌ بَيْنَ الْاِنْسَانِ وَبَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان ظلم۔ یعنی جو حقوق اللہ تعالےٰ کے بندے کے ذمہ ہیں وہ اس کو دینے کی بجائے دوسروں کو دیئے جائیں وَاَعْظَمُهُ الْكُفْرُ وَالشِّرْكُ وَالنِّفَاقُ اور ان معنوں کے لحاظ سے سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کیا جائے اس کے ساتھ شریک قرار دیا جائے اور نفاق سے کام لیا جائے حالانکہ مناسب تو یہ ہے کہ اللہ کے احکام کو مانا جائے اور اسکی توحید کا اقرار کیا جائے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے (۲) ظُلْمٌ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ النَّاسِ لوگوں کا آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرنا (۳) ظُلْمٌ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ نَفْسِهٖ انسان کا اپنے نفس پر ظلم کرنا چنانچہ آیت مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ میں یہی ظلم مراد ہے (مفردات) پس ظالم کے معنے ہونگے (۱) بے محل و بے موقعہ کام کرنے والا۔ (۲) کسی کے حق کو کم دینے والا۔ (۳) حد سے بڑھ جانے اور دوسرے کی ملکیت پر دست درازی کرنے والا۔ (۴) شرک کرنے والا۔ (۵) ظلم کرنے والا۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم اور اسکی بیوی یا آدم اور اس کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں رہنے کا حکم دیا جس کی تشریح دوسری جگہ یہ کی گئی ہے کہ وہ اس میں نہ بھوکا رہے گا نہ پیاسا اور نہ ننگا رہے گا اور نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائے گا اور یہ بھی حکم دیا کہ وہ اس میں جہاں سے چاہیں بافراغت کھائیں۔ اَلظّٰلِمِيْنَ

جنت سے مراد بعض نے کہا ہے کہ وہی جنت ہے جس میں انسان بعد الموت جائے گا اور بعض مفسرین نے اسے اسی زمین کا کوئی ٹکڑا قرار دیا ہے۔ بائبل میں ہے "اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا (پیدائش باب ۲ آیت ۸) اس کے بعد آیت ۱۴ میں یہ ذکر ہے کہ اس باغ کو دجلہ اور فرات سیراب کرتے ہیں گویا بائبل کا یہ بیان استعارہ اور حقیقت اور صحیح اور غلط سے مخلوط ہے لیکن دجلہ اور فرات کے پاس کے علاقہ کی اس سے تعیین ہو جاتی ہے چونکہ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے واقعات بھی اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مولد بھی اُور ہے جو عراق میں ہے اور جدید تحقیق سے بھی اُور اور اس کے گرد کا علاقہ کھودنے سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ملک نہایت قدیم تمدن کا گہوارہ رہا ہے پس ان حالات سے قرین قیاس یہی ہے کہ کہ آدم کا مولد عراق کا علاقہ ہی تھا اور جس جنت کا ان کے متعلق ذکر آتا ہے وہ بھی اسی علاقہ کا کوئی مقام تھا جسے مقام کے آرام دہ ہونے اور اس اچھے نظام کی وجہ سے جو آدم نے قائم کیا جنت کہا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے آثار قدیمہ کی تازہ کھدائیوں سے یہ علاقہ ایک نہایت قدیم تمدن کا گہوارہ ثابت ہوتا ہے چنانچہ اُور جو بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی جنت کی تعیین۔

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت ملک عراق کے کسی علاقہ میں ہونے کا ثبوت۔

حضرت آدم علیہ السلام کا وطن تھا اور جو دجلہ اور فرات کے ملنے کی جگہ کے قریب واقع ہے اس کی کھدائی جنگِ عظیم کے بعد اوّل اوّل مسٹر ہال نے اور ان کے بعد مسٹر وُڈلے نے کی ہے ان دونوں کی کھدائیوں کے نتیجہ میں اس شہر کے دبے ہوئے جو آثار ملے ہیں ان کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ سے ۳۵۰۰ سال پہلے معلوم ہوتا ہے (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا زیر لفظ Ur) بلکہ بعد کی تحقیق سے یہ آثار اس سے بھی بہت پہلے کے تمدن کے معلوم ہوتے ہیں (ایضاً) پس جبکہ ہم ایک طرف مغربی عرب میں کعبہ جیسے قدیم معبد کو دیکھتے ہیں دوسری طرف مشرقی طرف اُور کی قدیم ترین تہذیب کے آثار ہمیں ملتے ہیں اور معلومہ تاریخ کے زبردست تغیرات کا اس علاقہ کو مرکز پاتے ہیں تو یہ نتیجہ نکالنا بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ آدم کا مولد یا بشر کی تمدنی ترقی کا مبداء یہی علاقہ تھا۔

یہ خیال کہ آدم کو اس جنت میں رکھا گیا تھا جس میں نیک انسان بعد الموت جائیں گے بالبداہت باطل ہے اوّل تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً میں زمین میں خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں اور یہ امر خلافِ عقل ہے کہ آدم علیہ السلام کو انتظام تو دُنیا کا سپرد کیا گیا اور رکھا انہیں آسمان پر گیا۔ دوسرے اس جنت کی نسبت جو بعد الموت

حضرت آدم علیہ السلام کی جنت بعد الموت ملنے والی جنت نہ ہونے کے دلائل۔

ملنے والی ہے خود حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ سورہ حجر میں فرماتا ہے لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ (ع ۴) یعنی جنت اُخروی میں نہ تو انسانوں کو کسی قسم کی تکان ہوگی اور نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے لیکن آدم علیہ السلام کو جس جنت میں رکھا گیا وہ اس سے نکالے گئے پس معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کی جنت ارضی تھی آسمانی نہ تھی۔ تیسرے یہ کہ آدم علیہ السلام کی جنت میں شیطان کا داخل ہونا ثابت ہے بلکہ اس کی ذریت کا بھی۔ پس بفرضِ محال آدم کا جنت سماوی میں رکھنا اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ خلافِ عقل ہے کہ آدم کے ساتھ شیطان اور اس کی ذریت کو بھی جنت میں رکھ دیا گیا۔ اس آیت سے اس امر کا بھی استدلال ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام پہلے کسی اور جگہ رہتے تھے پھر جب ان پر الہام الٰہی نازل ہوا تو اپنی بیوی یا ساتھیوں سمیت اس مقام میں جا بسے جسے جنت کہا گیا ہے کیونکہ آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ اے آدم تُو اور تیرا زوج جنت میں ہی بسو پس معلوم ہوا کہ وہ پہلے کسی دوسری جگہ رہتے تھے۔

رَغَدًا کی تشریح جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی سہولت کے ساتھ اور کثرت کے ساتھ مل جائیں۔ اس میں تمدن کی خوبی بتائی گئی ہے تمدن ہی ہے جو انسان کے لئے با فراغت سامانِ زندگی مہیا کرتا ہے۔ غیر تمدن کے کھانے پینے کی اشیاء کا نہ تو خزانہ رکھا جا سکتا ہے اور نہ کثرت سے ان اشیاء کی پیداوار کی جا سکتی ہے۔ حیوانی زندگی میں ضروری اشیاء کے پیدا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کا ذخیرہ رکھا جا سکتا ہے اور کمی کے وقت انسان تکلیف اُٹھاتا ہے پس ان الفاظ میں تمدن کی خوبی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تم مل کر رہو گے تو ضروریات زندگی کو کثرت سے پیدا کر سکو گے اور ضرورت کے موقعہ کے لئے ان کا ذخیرہ رکھ سکو گے اور یہی وہ ارضی جنت ہے جس کی بنیاد تمدن کے ذریعہ سے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے رکھی گئی۔ جو قومیں اس تمدن کی نگہداشت کرتی ہیں ان کے تمام افراد آرام سے رہتے ہیں۔ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں اس تعلیم کے مطابق عمل کیا اور مسلمانوں کا بچہ بچہ بھوک اور پیاس اور تنگی کی زندگی سے محفوظ ہو گیا۔

بظاہر یہ ایک دُنیاوی حکم معلوم ہوتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ طریق زندگی انسان کو گناہ سے بچانے والا ہے لُوٹ کھسُوٹ اور دھوکے فریب کا بڑا باعث غربت اور بے سروسامانی ہوتے ہیں جو قوم اپنے تمام افراد کے کھانے پینے اور پہننے کا سامان مہیا کر دیتی ہے وہ اس کو گناہ میں پڑنے سے بچا لیتی ہے اور اس بڑے سبب کو جو ظلم اور گناہ کی طرف کھینچتا ہے دُور کر دیتی ہے پس گو بظاہر یہ کام دُنیاوی اور سیاسی نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً خالص دینی انتظام ہے اور گناہ کو جڑ سے اُکھیڑنے میں مدد ہے اس وقت دُنیا میں جو جھگڑا اور فساد پھیلا ہوا ہے اس کی وجہ یہی ہے

کہ بعض افراد تو مالا مال ہیں اور دوسرے بھوکے مر رہے ہیں اگر سب دُنیا میں ایسا نظام قائم ہو جائے کہ ہر شخص کو اسکی ضروریاتِ زندگی سہولت سے مل جائیں تو لڑائی جھگڑے کی جڑ کٹ جائے۔

حَيْثُ شِئْتُمَا جہاں چاہو کے الفاظ سے یہ بتایا ہے کہ انسانی تمدن کے کمال کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہے کہ انسان کو سفر اور اقامت کی سہولت حاصل ہو۔ اور اس پر سے غیر ضروری پابندیاں اُٹھا دی جائیں۔ موجودہ زمانہ کے فسادات کی ایک بڑی وجہ اس حکم کی طرف سے عدم اعتنا بھی ہے مختلف اقوام ایک دوسرے کے خلاف پابندیاں لگاتی ہیں کہ فلاں قوم ہمارے ملک میں نہ آئے یا ہمارے ملک میں نہ بسے اور اس طرح خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سب دنیا کو سب انسانوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اس قسم کی روکیں پیدا کر کے دوسروں کو خدائی نعمتوں سے محروم کرنا بڑا گناہ ہے اس وقت بعض بڑے بڑے براعظموں میں صرف چند لاکھ آدمی رہ رہے ہیں اور دوسروں کو ان ممالک میں آکر بسنے سے روکا جاتا ہے۔ ہندوستان میں چالیس کروڑ کے قریب آبادی ہے اور آسٹریلیا جو اس سے دُگنے کے قریب ہے اس میں کل ستر لاکھ آبادی ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کو اس میں جاکر بسنے سے روکا جاتا ہے اسی طرح جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو کامل شہری کے حقوق حاصل نہیں بلکہ اس ملک کے قدیم باشندوں کو بھی یہ حقوق حاصل نہیں چنانچہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی لیڈر گاندھی جی کی تمام طاقت کی بُنیاد انہی زخمی جذبات پر ہے جو جنوبی افریقہ کی رہائش کے ایام میں ان کے دل میں پیدا ہوئے۔

اس قسم کے امتیاز سے دلوں میں بغض اور کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلام نے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ہی اس قسم کی پابندیوں سے منع فرمایا ہے۔ اور تمام بنی نوع انسان کو دنیا سے یکساں فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی ہے کاش لوگ اس تعلیم پر عمل کرتے اور بغض اور فساد کا قلع قمع ہو کر یہ دُنیا جو اس وقت بعض لوگوں کے لئے جہنم بن رہی ہے سب کے لئے جنت بن جاتی۔

حَيْثُ شِئْتُمَا میں انسانی تمدن کے کمال کے ایک ضروری جزو کا ذکر ہے

شائد اس جگہ کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اسلام نے بھی تو حجاز میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کا داخلہ منع کیا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اسلام نے حجاز میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کا داخلہ منع کیا ہے لیکن اس کا اثر دُنیا کے اقتصادی معاملات پر نہیں پڑتا حجاز ایک وادی غیر ذی زرع ہے جہاں نہ کچھ پیدا ہوتا ہے نہ اُگتا ہے پس اس علاقہ کے ساتھ دُنیا کے کھانے پینے کا تعلق نہیں جس علاقہ میں نہ فصل ہوتی ہو نہ میٹھا پانی ملتا ہو۔ اقتصادی ضرورتوں کے لئے لوگوں نے وہاں جاکر کرنا کیا ہے وہاں تو وہی لوگ جاکر بسنے کی خواہش کرینگے جن کو اس جگہ سے مذہبی لگاؤ ہو اور وہ لوگ خواہ کسی قوم کے ہوں اس جگہ جا سکتے ہیں شائد اللہ تعالےٰ نے اپنی اول اور آخر مسجد کے لئے اس وادی غیر ذی زرع کو چنا ہی اس لئے تھا تاکہ اس کے مذہبی نظام کے قیام کے لئے دوسرے مذاہب کو اس سے روکا جائے تو کسی کو یہ اعتراض نہ ہو کہ اس طرح ہمیں دنیوی فوائد اور ثمرات سے محروم کر دیا گیا ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ کعبہ کو کسی سرسبز جگہ بنایا جاتا مگر ایسا ہوتا تو دوسرے مذاہب کے لوگ دنیوی فوائد سے محروم رہ جاتے یا پھر اسے دین کے لئے محفوظ قلعہ نہ بنایا جا سکتا۔

اسلام کسی قوم کو کسی ملک میں جاکر بسنے سے نہیں روکتا۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اور اس شجرہ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔

یہ شجرہ جس کے پاس جانے سے آدم کو روکا گیا تھا کیا تھا؟ یہ سوال بڑا ہی محلِ اختلاف بنا رہا ہے بعض نے اسے عورت کہا ہے بعض نے گندم کا دانہ اور بعض نے انگور لیکن یہ سب معانی خلافِ قرآن ہیں۔ عورت اس سے مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ آدم علیہ السلام کو بیوی سمیت اس میں رہنے کا حکم دیا

شجرہ ممنوعہ کے متعلق پہلے مفسرین کا خیال باطل کا رد۔

گیلہے گندم بھی اس سے مراد نہیں ہو سکتی اور نہ انگور کہ یہ دونوں اشیاء حلال ہیں اور اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ کُلَا مِنْهَا رَغَدًا اس علاقہ میں سے اپنی غذا بافراط حاصل کرو۔

بائبل کا شجرہ ممنوعہ کو شجرہ علم قرار دینا اور اس کا بطلان۔

بائبل میں اسے شجرۂ علم قرار دیا گیا ہے لکھا ہے ”اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اس سے کھائے گا ضرور مرے گا“ (پیدائش باب ۲ آیت ۱۶ و ۱۷) بائبل کا یہ بیان بالبداہت باطل ہے کیونکہ نیک و بد کی پہچان ہی تو انسان کو دوسرے حیوانوں سے افضل بناتی ہے ورنہ بیل گھوڑے گدھے اور انسان میں فرق ہی کیا ہے اور جبکہ خود بائبل کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر اور اپنی مانند بنایا (پیدائش باب ۱ آیت ۲۶) تو اس کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس میں نیک و بد کی پہچان رکھی اور علم اور عرفان کا مادہ رکھا ورنہ خدا کی صورت اور اسکی مانند کے اور کیا معنے ہو سکتے ہیں اور جب آدم کو خدا کی صورت اور اس کی مانند بنایا گیا تھا تو وہ تو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی نیک و بد کو پہچاننے والا تھا اس غرض کے لئے اسے کسی درخت کا پھل کھانے کی کیا ضرورت تھی اپنی مانند پیدا کر کے اسے نیک و بد کی پہچان کا درخت کھانے سے روکنے کے تو یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے خود اپنا کام باطل کیا اور بچوں کا سا کھیل کھیلا جو پہلے ایک گھروندا بناتے ہیں اور پھر اسے توڑ دیتے ہیں۔

آیت ۳۶ وَلَا تَقْرَبَا میں الشَّجَرَةَ کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اس درخت سے مراد نہ تو گندم اور انگور ہے اور نہ نیک و بد کی شناخت ہے تو پھر اس درخت سے کیا مراد ہے جس کے پاس جانے سے آدم علیہ السلام کو روکا گیا؟ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے آدم علیہ السلام پر ان کا ننگ ظاہر ہو گیا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ درخت کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا ہے کیونکہ دُنیا کے پردہ پر کوئی ایسا درخت نہیں جس کا پھل کھانے سے انسان پر اس کا ننگ ظاہر ہوتا ہو۔ دوسرے ہم دیکھتے ہیں کہ نہ

شجرہ کا لفظ استعارۃً استعمال ہونے کے چار ثبوت۔

اسلامی شریعت میں اور نہ کسی قدیم شریعت میں کوئی درخت ایسا ملتا ہے جس کے پھل کا استعمال شرعاً ممنوع ہو تو یہ امر اس امر کے لئے مزید شہادت ہے کہ شجرہ سے مراد اس جگہ درخت نہیں بلکہ استعارۃً کسی اور چیز کا نام درخت رکھا گیا ہے تیسرے قرآن کریم فرماتا ہے کہ اس درخت کے قریب جانے سے آدم اور اس کی بیوی یا اس کے ساتھی ظالم ہو جائیں گے یہ امر بھی ظاہر کرتا ہے کہ درخت کا لفظ اس جگہ استعارۃً استعمال ہوا ہے کیونکہ اگر کوئی ممنوع درخت ہوتا تو اسکے پھل کے استعمال سے وہ گنہ گار تو ہو سکتے تھے ظالم نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ظلم کا لفظ یا تو شرک کے معنوں میں قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے یا پھر دوسروں کے حقوق کے تلف کرنے کے معنوں میں چوتھے ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ ایک خاص درخت کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کر کے آدم کو منع فرمایا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ دوسری طرف فرماتا ہے کہ شیطان کے بہکانے پر انہوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ اب اگر یہ ممنوع چیز ظاہری درخت ہوتا تو یہ تصور آدم کا دیدہ دانستہ ہو سکتا تھا۔ ایک معین درخت جس سے منع کیا گیا تھا اس کا پھل کھانا کسی صورت میں غلطی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن تیسری طرف ہم قرآن کریم میں یہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں فَنَسِيَ (طٰهٰ ع ۶) آدم نے اس پھل کو بھول کر کھایا تھا جان بوجھ کر نہیں کھایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ درخت سے مُراد کوئی ظاہری درخت نہ تھا بلکہ کوئی اور چیز تھی جس کے بارہ میں غلطی لگنے کا امکان ہو سکتا ہے اور یہ چیز معنوی درخت ہی ہو سکتی ہے مثلاً ظلم کا درخت کہ اگر اس کے قریب جانے سے منع کیا جائے تو یہ کوئی ایسا معیّن حکم نہ ہو گا جس میں غلطی نہ لگ سکے یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص کو ظلم سے منع کیا جائے اور وہ اس سے بچنا بھی چاہے لیکن اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جائے جو ہو تو ظلم۔ لیکن وہ شخص اسے ظلم نہ سمجھے۔

غرض ان سب امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز سے آدم علیہ السلام کو روکا گیا تھا اسے استعارۃً شجر کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے ورنہ وہ تھی کچھ اور۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں شجرہ کا لفظ کسی اور

معنوں بھی استعمال ہُوا ہے یا نہیں یا یہ کہ استعارۃً کسی اور چیز کو بھی شجرہ کہا گیا ہے یا نہیں۔

شجرہ کا لفظ قرآن کریم میں استعارۃً اچھی اور بُری باتوں کی نسبت استعمال ہُوا ہے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (ابراہیم ع ۴) یعنی کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح پاک بات کی کیفیت پاک درخت کی مثال سے بیان فرمائی ہے پھر فرماتا ہے وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ (ابراہیم ع ۴) بُری بات کی کیفیت بُرے درخت کی طرح ہوتی ہے ان معنوں کے رُو سے اس درخت کے پاس نہ جاؤ کے یہ معنے ہونگے کہ جس طرح اوپر بعض اچھی باتوں کا ذکر تھا ان کے مد مقابل کاموں سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو منع فرمایا اور چونکہ اس اچھے نظام کو جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو دیا تھا جنّت یعنی باغ سے مشابہت دی تھی اس نظام کے خلاف جو امور تھے انہیں بھی درخت کے نام سے یاد کیا گیا۔ اور فرمایا کہ جہاں اس جنّت میں تم کو رہنے کا حکم ہے وہاں اس کے خلاف امور سے بچنے کی بھی تاکید ہے تا وہ جنّت ضائع نہ ہوجائے ان معنوں کے روسے آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ بعض باریک امور میں آدم علیہ السلام کو غلطی بھی لگ سکتی تھی اور کوئی دوسرا آدمی انہیں دھوکا بھی دے سکتا تھا۔

گو شجرہ سے مراد تمام وہ بدیاں ہوسکتی ہیں جن سے آدم علیہ السلام کو منع کیا گیا تھا۔ مگر اس آیت کے مضمون کے لحاظ سے خصوصیت سے یہ امر اس شجرۂ ممنوعہ میں داخل ہوگا کہ ابلیس اور اسکی ذرّیت سے بچ کر رہیں کیونکہ اس نے آدم اور انکی اولاد کو گمراہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰہٰ ع ۷) یعنی ہم نے کہا کہ اے آدم یہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی یا ساتھیوں کا دشمن ہے پس اس سے بچتے رہیو ایسا نہ ہو کہ یہ تم کو جنت سے نکال دے تو تم تکلیف میں پڑ و اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم کہ ابلیس سے بچتے رہو اس شجرہ کی ایک ضروری شاخ تھی جس کے قریب نہ جانے کا آدم کو حکم دیا گیا تھا۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ سلسلہ نسب کو بھی شجرہ کہتے ہیں تو اس موقعہ پر شجرہ کے لفظ کا استعمال نہایت لطیف معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابلیس سے بچنے کا حکم جب دیا گیا تو اسکی ذریت یعنی اس کے اتباع اس حکم میں شامل تھے۔

قرآن کریم میں شجرہ کے لفظ کا استعمال بُری اور اچھی باتوں کے لئے

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آدم اور اللہ تعالےٰ کی گفتگو عام انسانی بول چال کی طرح نہیں تھی وہ لازماً اسی طرح ہوئی ہوگی جس طرح سب انبیاء کے ساتھ خدا تعالیٰ کی گفتگو ہوتی ہے یعنی الہام اور وحی کے ذریعہ سے اور الہام اور وحی میں استعارۃ اور مجاز اور تمثیل کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام جمیل وحسین ہوتا ہے اور استعارہ مجاز اور تمثیل کلام کو حسین بنا دیتے ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک ایسے مقام میں رہنے کا حکم دیا جو نہایت آرام دہ تھا اور بمنزلہ جنّت کے تھا اور ایسی شریعت عطا کی جو اس دنیا کو جنّت بنا دینے والی تھی اور ایسی بیوی اور ساتھی بخشے جو مطیع اور فرمانبردار تھے اور ہر قسم کے آرام کا موجب ہوکر اس زندگی کو جنّت میں تبدیل کر دینے والے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آدم علیہ السلام سے کہا کہ اب تو اور تیرے ساتھی اس جنّت میں رہو اور اسی استعارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے نظام کی خرابیوں اور بُرے ساتھیوں کو ایک درخت قرار دیکر فرمایا۔ کہ ایک طرف تو اس جنّت میں رہنے کا ہم تم کو حکم دیتے ہیں اور دوسری طرف اس کے مخالف صفات والے درخت سے بچنے کا حکم دیتے ہیں۔

اچھی نظام کو جنّت اور اسکے مقابل کے نظام کو شجرہ ممنوعہ قرار دیا جانا۔

غرض شجرہ کا لفظ جنّت کے لفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے استعمال کیا گیا۔

شجرہ ممنوعہ سے مراد ابلیس اور اسکی ذریت۔

اچھے نظام اور عمدہ ساتھیوں کو جنّت کہہ کر جو بہت سے درختوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور بُری باتوں اور بُرے ساتھیوں کو شجرہ کہہ کر جس کے معنے ایک درخت کے ہیں

الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَ

شیطان نے اس (درخت) کے ذریعہ سے اُن (دونوں) کو (انکے مقام سے) ہٹا دیا اور (اس طرح) اس نے انہیں اس (حالت) سے جس میں وہ تھے نکال دیا

قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي

اور (اس کے نتیجہ میں) ہم نے (انہیں) کہا (کہ یہاں سے) نکل جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں۔ اور (یاد رکھو کہ) تمہارے لئے ایک

الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ

(مقرر) وقت تک اسی زمین میں جائے رہائش اور سامانِ معیشت (مقدر) ہے ۳۷ ؎ اس کے بعد آدم نے

مندرجہ ذیل امور کی طرف ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے (۱) آدم کو جو تعلیم دی گئی ہے اس میں اشیاء کی حلت اصل ہوگی اور حرمت کے احکام محض ضرورتاً دیئے جائینگے اور اس طرح حلال اشیاءٗ حرام اشیاء کے مقابلہ پر بہت زیادہ ہونگی (۲) آدم کی جماعت غالب آجائیگی اور تعداد میں بڑھ جائیگی اور اس کے دشمن قلیل ہونگے حتیٰ کہ اگر آدم کے نظام اور اسکی جماعت کو ایک باغ کا نام دیا جاسکے گا تو اس کے دشمنوں اور ان کے نظام کو ایک درخت کہا جاسکے گا جس کا سایہ محدود ہوتا ہے اور پھیلاؤ تنگ۔

الشَّیْطٰنُ ؎ عَنْهَا ؎ اپنے نظام اور اپنے ساتھیوں کو جنت یعنی درختوں کا مجموعہ اور اپنا [illegible] کو ایک درخت سے تعبیر کرنے میں لطیف اشارے۔ اَزَلَّهُمَا ؎ اِهْبِطُوْا ؎

۳۷؎ حل لغات

:۔ اَزَلَّهُمَا۔ اَزَلَّهٗ کے معنے ہیں اَزْلَقَهٗ اس کو اس کے مقام سے ہٹا دیا حَمَلَهٗ عَلَى الزَّلَّةِ اس کو لغزش پر آمادہ کیا (اقرب) مفردات میں ہے اَلزَّلَّةُ فِي الْاَصْلِ اِسْتِرْسَالُ الرِّجْلِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ کہ اصل وضع لغت کے لحاظ سے زَلَّةٌ کے معنے ہیں پاؤں کا بغیر قصد کے پھسل جانا وَقِيْلَ لِلذَّنْبِ مِنْ غَيْرِ قَصْدٍ زَلَّةٌ تَشْبِيْهًا بِزَلَّةِ الرِّجْلِ بغیر ارادہ کے کسی غلطی اور قصور کے ہو جانے کو بھی زَلَّة سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ جس طرح بغیر ارادہ کے پاؤں پھسل جاتا ہے اسی طرح بعض اوقات بعض غلطیاں بھی بغیر ارادہ کے وقوع ہو جاتی ہیں گویا پاؤں کا بغیر ارادہ کے پھسلنا اور غلطی کا بغیر ارادہ کے وقوع پذیر ہونا دونوں آپس میں مشابہ ہیں (مفردات) لسان میں ہے اَزَلَّهٗ اَيْ حَمَلَهٗ عَلَى الزَّلَلِ اس کو قصور اور خطا کرنے پر آمادہ کیا (لسان)

اَلشَّيْطٰنُ :۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۱۵؎

عَنْهَا :۔ عَنْ حرف جار ہے اور یہ دس معانی ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک تعلیل کے ہیں (مغنی) یہی معنی ادا کرنے کے لئے آیت فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا میں عَنْ استعمال ہوا ہے یعنی حَمَلَهُمَا عَلَى الزَّلَّةِ بِسَبَبِهَا اَيْ بِسَبَبِ الشَّجَرَةِ یعنی اس درخت کے ذریعہ سے ان دونوں کو ان کے مقام سے ہٹا دیا۔

اِهْبِطُوْا :۔ اِهْبِطُوْا امر مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور هَبَطَهٗ (يَهْبُطُ هَبْطًا) مِنَ الْجَبَلِ کے معنے ہیں اَنْزَلَهٗ اس کو پہاڑ سے اتارا۔ هَبَطَ بَلَدًا كَذَا۔ دَخَلَهٗ کسی شہر میں داخل ہوا (یہ متعدی بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ هَبَطَهٗ بَلَدًا كَذَا کے معنے ہونگے اَدْخَلَهٗ اس کو فلاں شہر میں داخل کیا) هَبَطَ السُّوْقَ :۔ اَتَاهَا بازار میں آیا۔ هَبَطَ فُلَانٌ مِنَ الْجَبَلِ (يَهْبُطُ وَيَهْبِطُ هُبُوْطًا) نَزَلَ پہاڑ سے اترا۔ هَبَطَ الْوَادِيَ : نَزَلَهٗ وادی میں اترا۔ هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰى مَوْضِعٍ آخَرَ : اِنْتَقَلَ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا (اقرب) پس اِهْبِطُوْا کے معنے ہونگے اپنے جائے قیام کو چھوڑ کر کسی

اور جگہ قیام پذیر ہو جاؤ (۲) نکل جاؤ۔

اَلْاَرْضُ :۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بذا ۱۲ـــــہ

مُسْتَقَرٌّ :۔ اَلْمُسْتَقَرُّ اِسْتَقَرَّ سے ظرف ہے اور اِسْتَقَرَّ بِالْمَكَانِ کے معنے ہیں ثَبَتَ وَسَكَنَ کسی جگہ میں ٹھہرا۔ رہائش اختیار کی اور اَلْمُسْتَقَرُّ کے معنے ہیں مَوْضِعُ الْاِسْتِقْرَارِ۔ قرارگاہ۔ جائے رہائش (اقرب)

مَتَاعٌ :۔ كُلُّ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ مِنَ الْحَوَائِجِ كَالطَّعَامِ وَالْبَزِّ وَ اَثَاثِ الْبَيْتِ وَالْاَدَوَاتِ وَالسِّلَعِ وہ تمام اشیاء جن سے ضرورت کے وقت فائدہ اٹھایا جاتا ہے مَتَاعٌ کہلاتی ہیں۔ جیسے خوراک۔ پوشاک گھر کا سامان۔ فروخت کی چیزیں وغیرہ وَقِيْلَ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ مِنْ عُرُوْضِ الدُّنْيَا قَلِيْلِهَا وَكَثِيْرِهَا مَا سِوَى الْفِضَّةِ وَالذَّهَبِ۔ اور بعض کے نزدیک دنیا کا سامان جس سے نفع اُٹھایا جاتا ہے وہ متاع ہے خواہ وہ تھوڑا ہو یا بہت سوائے سونے اور چاندی کے۔ وَعُرْفًا كُلُّ مَا يَلْبِسُهُ النَّاسُ وَيَبْسُطُهُ اور عرف عام میں متاع ان کپڑوں کو کہتے ہیں جو انسان پہنتا ہے یا فرش وغیرہ جو بچھائے جاتے ہیں وَفِي الْكُلِّيَّاتِ اَلْمَتَاعُ وَالْمُتْعَةُ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ اِنْتِفَاعًا قَلِيْلًا غَيْرَ بَاقٍ بَلْ يَنْقَضِيْ عَنْ قَرِيْبٍ کلیات ابی البقاء میں ہے کہ متاع اور متعہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے قلیل فائدہ حاصل کیا جاتا ہو۔ اور جس کا فائدہ مستقل نہ ہو بلکہ جلدی ختم ہو جائے۔ وَ اَصْلُ الْمَتَاعِ مَا يُتَبَلَّغُ بِهٖ مِنَ الزَّادِ۔ متاع اصل میں وہ زاد ہے جس کے ذریعہ سے منزل مقصود تک پہنچا جائے وَيَأْتِي الْمَتَاعُ اِسْمًا بِمَعْنَى التَّمْتِيْعِ اور یہ لفظ اسم و مصدر کے طور پر تمتیع کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی سامان دینا (اقرب)

حِيْنٍ :۔ اَلْحِيْنُ کے معنے ہیں وَقْتٌ مُبْهَمٌ يَصْلُحُ لِجَمِيْعِ الْاَزْمَانِ طَالَ اَوْ قَصُرَ مطلق وقت خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ وَقِيْلَ اَوِ الدَّهْرُ بعض محققین لغت نے اس کے معنے "ایک لمبے زمانہ" کے کئے ہیں۔ نیز اس کے ایک معنی اَلْمُدَّةُ کے ہیں یعنی کچھ وقت (اقرب)

_{۱ اَلْاَرْض}
_{۱ مُسْتَقَرٌّ}

تفسیر ۔ عَنْهَا میں ھا کی ضمیر جنّت کی طرف بھی جا سکتی ہے اور شجرہ کی طرف بھی۔ جنّت کی طرف ضمیر پھیرنے کی صورت میں اس کے یہ معنی ہونگے کہ شیطان نے آدم کو جنّت سے الگ کر دیا یا یہ کہ شیطان کے دھوکے کی وجہ سے جنّت کی حالت میں فرق آ گیا اور وہ ایک وقت کے لئے تکلیف کا مقام بن گئی شجرہ کی طرف ضمیر پھیرنے کی صورت میں عَنْ کے معنے سبب کے ہونگے اور مطلب یہ ہوگا کہ اس درخت کو ذریعہ بنا کر آدم کو اس کے مقام سے پھسلا دیا لیکن جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے اَزَلَّ کے لفظ میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ جس شخص سے وہ فعل ہوا اس کا اس میں ارادہ نہ تھا پس معنے یہ ہونگے کہ اس درخت کے ذریعہ سے شیطان نے آدم کا قدم پھسلا دیا لیکن آدم کا اس میں ارادہ شامل نہ تھا سب کچھ دھوکے اور فریب سے ہُوا۔

_{۲ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عنھا کی ضمیر جنّت، شجرہ دونوں کی طرف جا سکتی ہے}
_{۱ مَتَاعٌ}

عَنْ کے معنے سببیت کے عربی زبان میں عام ہیں لغت میں لکھا ہے اَلرَّابِعُ التَّعْلِيْلُ نَحْوُ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ (اقرب) یعنی چوتھے معنے عَنْ کے تعلیل کے ہوتے ہیں جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ (توبہ ع ۱۴) جس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیم نے جو استغفار اپنے باپ کے لئے کیا تھا وہ صرف ایک وعدہ کے سبب سے تھا جو وہ اس سے کر چکے تھے ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عَنْهَا کے معنے یہ ہونگے کہ شجرہ کو سبب اور ذریعہ بنا کر شیطان نے حضرت آدم کے قدم کو بغیر اس کے کہ ان کا اپنا ارادہ ہوتا پھسلا دیا۔

_{۳ عنھا کی ضمیر شجرہ کی طرف پھیرنے سے عَنْ کے معنے سببیت کے ہوتے ہیں}

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ۔ اور اس طرح جس حالت میں وہ تھے اس سے انہیں نکال دیا یا یہ کہ جس جنّت میں وہ تھے وہاں سے انہیں نکال دیا۔ مگر پہلے معنے زیادہ

_{۱ حِيْنٍ}

درست ہیں کیونکہ جنت میں سے نکلنے کا حکم اس کے بعد دیا گیا ہے ہاں اگر یہ مطلب لیا جائے کہ جنت میں سے نکالے جانے کا مستحق بنا دیا تو دوسرے معنے بھی درست ہو سکتے ہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا کی تشریح۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا۔ اور ہم نے کہا کہ جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہونگے یعنی اس دشمنی کو یہیں ختم نہ سمجھنا یہ دشمنی آئندہ جاری رہے گی اور ہر نبی کے وقت میں پھر شیطان اسی طرح حملہ کرنے کی کوشش کیا کرے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ کی تشریح۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ یعنی اسی زمین میں تم کو رہنا اور فائدہ اُٹھانا ہے پس ہوشیاری سے کام کرنا یہ شیطان کی ذریت سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نہیں اس کے ساتھ ہی رہنا ہوگا پس ہر وقت چوکس رہنے کی کوشش کرو۔ دوسرے یہ زندگی آئندہ زندگی کے لئے سامان جمع کرنے کا ذریعہ ہے اس سے غافل نہ رہو اور دوسری زندگی کے لئے سامان جمع کرتے رہو۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ کو مومنوں کو اپنی اولاد کو شیطان سے بچاتے رہنے کا حکم

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مومن و کافر نیک اور بد کو ایک ہی جگہ رہنا پڑتا ہے اس لئے مومنوں اور نیکوں کو اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو شیطان کے حملہ سے بچانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے یہ حکم ایسا ضروری ہے کہ اسے نظر انداز کرنے کی وجہ ہی سے ہمیشہ نیکی کا زمانہ مٹ جایا کرتا ہے جب بھی مومن اور نیک یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شیطانی حملہ سے محفوظ ہو گئے ہیں تنزل کا دور شروع ہو جاتا ہے اور شیطان غالب آنے لگ جاتا ہے کاش کوئی قوم ایسی پیدا ہو جو اس حکم کو مدنظر رکھے اور شیطان کا سر پوری طرح کچلا جائے۔ لوگ خود نیک بھی ہو جائیں تو اولاد کی محبت یا ان پر حد سے زیادہ اعتماد کر کے اسے خرابی میں پڑنے کا موقع بہم پہنچا دیتے ہیں اور پھر قوم نیکی کی چوٹی سے نیچے گر جاتی ہے۔

اس سوال کا جواب کہ آدم علیہ السلام کو شجرہ کے ذریعہ سے شیطان نے کس طرح دھوکا دیا۔

آیت وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ سے مسلمانوں کے ایک غلط عقیدہ کا قلع قمع

اس آیت سے ایک اور زبردست استدلال ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ایک غلط عقیدہ کا قلع قمع کرتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور انکی اولاد کے لئے اسی دُنیا میں رہنے کا فیصلہ فرمایا ہے اور شیطانی حملہ سے بچنے کے لئے کسی اور جگہ جانے کو ناممکن بنایا ہے لیکن باوجود اس کے بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر شیطان کی ذریت نے حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ ان سے بچانے کے لئے انہیں آسمان پر لے گیا۔ یہ عقیدہ اس آیت کے صریح خلاف ہے اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ باوجود شیطان کے حملہ کے آدم اور انکی اولاد کو اسی دُنیا میں رہنا ہوگا پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ آسمان پر لیجاتا اگر کوئی حقدار تھا کہ اسے آسمان پر لے جایا جاتا تو وہ آدم علیہ السلام تھے جو سب سے پہلے نبی تھے یا پھر سیّد ولد آدم حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے مگر حضرت آدم کی نسبت تو مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں شیطان کے حملہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان سے زمین پر پھینک دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ جانا پڑا اگر اللہ تعالیٰ نے ان دو کی نسبت اس آیت کا بیان کردہ قانون نہیں بدلا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت کیونکر بدل دیا اور خود اپنے فیصلہ کو کیوں غلط کر دیا۔

آدم علیہ السلام کو اس شجرہ کے ذریعہ سے شیطان نے کس طرح دھوکا دیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو ابلیس سے بھی اور اس درخت سے بھی ہوشیار کر دیا تھا تو پھر وہ شیطان کے دھوکے میں کس طرح آئے کچھ جواب تو اس کا میں اوپر دے آیا ہوں کچھ اس جگہ بیان کرتا ہوں۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ جہاں تک ابلیس سے دھوکا کھانے کا سوال ہے اس دھوکے کی وجہ یہ ہے کہ گو آدم علیہ السلام کو ابلیس سے بچنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا منشاء اس سے یہ تھا کہ ابلیس اور اُس کے اتباع سے بچو کیونکہ ابلیس تو ایک بدی کی محرک رُوح ہے وہ براہ راست تو اگر آدم کو دھوکا دے نہ سکتی تھی اس کے اتباع ہی بُری تحریکوں کا موجب ہو سکتے تھے مگر یہ اتباع چونکہ انسان ہوتے ہیں بسا اوقات ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کبھی وہ ظاہر میں مومن بنکر ساتھ آملتے ہیں اور اس طرح دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں

اور انسان کے لئے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا یہ اب بھی ابلیس کے اتباع ہیں یا مومن ہو کر خیر خواہ ہو گئے جس شیطان کا اس جگہ ذکر ہے اس نے بھی اس ترکیب کو استعمال کیا تھا چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (اعراف ع ۲) یعنی اس شیطان نے آدم اور اس کے ساتھی کے سامنے قسمیں کھا کر کہا کہ میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں گویا مخالفت کا رنگ چھوڑ کر وہ ساتھ آ شامل ہوا اور اپنے اخلاص کا انہیں یقین دلایا اس صورت میں آدم علیہ السلام کو دھوکا لگنا بالکل ممکن تھا کیونکہ انہوں نے یہ اجتہاد کیا کہ گو یہ شخص پہلے ابلیس کا ظل تھا اور اس وقت اس سے بچنا ضروری تھا مگر اب تو یہ مخالفت کا راستہ ترک کر کے ہمارے ساتھ آ ملا ہے اور قسمیں کھاتا ہے کہ میں تمہارا مخلص خادم ہوں اب اس سے تعلق رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ اجتہاد گو غلط تھا مگر باوجود ابلیس سے بچنے کے حکم کے اس اجتہاد کی وجہ سے دھوکا کھا جانا بالکل ممکن تھا اور یہ دھوکا خلافِ عقل نہیں ایسے ہی لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ۝ (منافقون ع ۱) یعنی جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ تُو واقعہ میں اس کا رسول ہے مگر اللہ انکی گواہی کے مقابل پر یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں ان لوگوں نے اپنی قسموں کو اپنے بچاؤ کے لئے ڈھال بنا رکھا ہے۔ اور اس طرح یہ اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں ان کے یہ عمل بہت ہی بُرے ہیں۔ یہ اعمال ان سے اس وجہ سے سرزد ہوتے ہیں کہ یہ لوگ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پس ان کے دلوں پر مہریں کر دی گئیں اور اب یہ کچھ نہیں سمجھتے اور جب تُو ان پر نگہ کرے تو ان کے جسم تجھے پسند آتے ہیں اور اگر یہ بات کریں تو انکی باتوں کو معقول سمجھ کر سُنتا ہے مگر یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے بڑی بڑی لکڑیاں ٹیک لگا کر کھڑی کی ہوں یعنی مجالس میں بڑی شان سے اور رُعب سے بیٹھتے ہیں جو عذاب بھی آئے یہ اسے اپنے ہی خلاف سمجھتے ہیں یہ لوگ اصل دشمن ہیں ان سے بچ کر رہ۔ اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کدھر لوٹے جا رہے ہیں۔

ان آیات میں منافقوں کی حالت کا وہی نقشہ کھینچا گیا ہے جو اوپر کی آیت میں شیطان کا کھینچا گیا ہے یہ بھی قسمیں کھاتے تھے جس طرح شیطان نے قسمیں کھائی تھیں یہ بھی اپنے اخلاص کا دعویٰ کرتے تھے جس طرح شیطان نے کیا تھا اور انکی باتیں بھی بظاہر ایسی ہوتی تھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دھوکا کھا جاتے کہ بڑے اچھے مشورے دے رہے ہیں اسی طرح شیطان کی بات پر آدم نے یقین کر لیا صرف فرق یہ ہے کہ سیدِ ولدِ آدم چونکہ آخری نبی تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان شیطانوں کے حملے سے اپنے الہام سے بروقت خبردار کر دیا اور وہ اسلام کو عارضی نقصان بھی نہ پہنچا سکے مگر آدم کا شیطان یا اپنے وقت کا عبداللہ بن ابی بن سلول عارضی طور پر آدم کو جنّت سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔

شیطان کا یہ کہنا کہ میں آپ کا مخلص ہوں اسی لئے تھا کہ آدم علیہ السلام کو یقین دلائے کہ ابلیس اور اس کی ذریت سے بچنے کا حکم بیشک آپ کو ملا تھا مگر میں تو اب آپ کا مخلص ہوں اس لئے اب میں ابلیس کی ذریت سے نہیں رہا بلکہ آپ کی ذریّت سے ہو گیا ہوں اسکی ان چکنی چپڑی باتوں سے

آدم علیہ السلام کو دھوکا لگ گیا اور انہوں نے سمجھا کہ یہ تو کہتا ہے جب سے ہمارا مخلص ہو گیا ہے تو اب اس سے بچنے کی کیا ضرورت ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خبردار کر دیا کہ منہ سے یہ منافق کس قدر ہی اخلاص کے دعوے کریں مگر هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ اصل دشمن یہی ہیں پس تو ان سے بچ۔

اس سوال کا جواب کہ حضرت آدم علیہ السلام شیطان کے دھوکے میں کیونکر آئے۔

اب سوال کا یہ دوسرا پہلو حل کرنے کے قابل رہ جاتا ہے کہ شیطان چونکہ ابلیس کے علاوہ اور وجود تھا اس لئے اس نے اپنے مومن اور مخلص ہونے کا دھوکا دیکر حضرت آدم کو غافل کر دیا مگر وہ بات جو اس نے کی ہوگی وہ تو خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہی ہوگی پھر اس بات کے ماننے کے لئے آدم علیہ السلام کس طرح تیار ہو گئے اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح آدمی ایک غلط جبہ پہن کر دوسرے کو دھوکا دے دیتا ہے اسی طرح وہ باریک امور میں غلط امور کو غلط رنگ دیکر اچھا بنا کر بھی دکھا دیتا ہے۔ دیکھو اسی سورۃ کے شروع میں اللہ تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ (بقرہ عٓ) یعنے جب ان منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ کفار سے میل جول رکھ کر فساد پیدا نہ کرو۔ تو وہ کہتے ہیں کہ واہ ہم پر فساد کا الزام لگاتے ہو حالانکہ ہم ہی اصلاح کی سچی کوشش کرنے والے ہیں ہمارا کفار سے ملنا تو اس غرض سے ہے کہ ان کے جوشوں کو دبائیں اور مسلمانوں کی طرف ان کو مائل کریں۔ اس جواب میں انہوں نے اپنے بُرے فعل کی اچھی توجیہ کر دی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو بھی رغبت دلائی ہے کہ تم بھی اسی طرح کرو تاکہ فساد جاتا رہے۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے بھی یہی طریق اختیار کیا تھا چنانچہ فرماتا ہے شیطان نے آدم علیہ السلام کو شجرۂ ممنوعہ کے قریب لے جانے کے لئے کہا کہ قَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ (اعراف عٓ) یعنے شیطان نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ آپ کو شجرۂ ممنوعہ سے بچنے کی حکمت پر غور کرنا چاہئے صرف حکم کے ظاہری الفاظ کو نہیں دیکھنا چاہیئے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ اس شجرہ سے بچ کر آپ فرشتے ہو جائیں اور ہمیشہ کی زندگی پائیں پس جب یہ حکم آپ کو نیک بنانے اور دائمی زندگی دینے کے لئے تھا تو اب اگر اس شجرہ کے قریب جانے سے وہی غرض پوری ہوتی ہو تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی رُوح کو مقدم رکھتے ہوئے اب آپ کو اس کے قریب جانے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے اور اس کے قریب جانے کو ہی منشائے الٰہی کو پُورا کرنے والا سمجھنا چاہیئے چنانچہ دوسری جگہ اسکی تشریح یُوں آتی ہے فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَا يَبْلٰى (طٰہٰ ع ۷) یعنی شیطان نے آدم علیہ السلام کو یہ دھوکا دیا کہ اے آدم کیا میں تم کو وہ درخت بتاؤں جو دائمی زندگی بخشنے والا ہے اور ایسی بادشاہت بخشے گا جو کبھی تباہ نہ ہوگی (یعنے فرشتوں جیسی زندگی جو کبھی تنزّل کی طرف نہیں جاتے)

سورۂ اعراف کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اس امر کو آدم علیہ السلام کے سامنے رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت سے اس لئے روکا تھا کہ تا اس سے رُک کر آپ فرشتے ہو جائیں اور دائمی زندگی پائیں اور طٰہٰ کی آیت بتاتی ہے کہ اس درخت کے قریب لے جانے کے لئے اس نے کہا کہ اس کے قریب جا کر آپ دائمی زندگی پائینگے ان دونوں آیتوں کو ملا کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا فریب یہی تھا کہ اس نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی بات کی تصدیق کر کے آدم علیہ السلام کے سامنے اپنے ایمان کا ثبوت دیا دوسری طرف اجتہاد کی آڑ لے کر یہ بتایا کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی غرض اور اس کا منشاء اس درخت سے دُور رہ کر نہیں بلکہ اس کے قریب جا کر پُورا ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے اور اس کے حکم کی رُوح کو مقدم رکھتے ہوئے اب آپ کو اس درخت کے قریب جانا چاہیئے آدم علیہ السلام اس کے اس دھوکے میں آ گئے اور اسکی بات کو مان لیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنت دُکھ کا مقام بن گئی ظاہر ہے کہ

اس قسم کا دھوکا بعض باریک مسائل کے متعلق خواص کو بھی لگ سکتا ہے اور آدم علیہ السلام تو پہلے نبی تھے ان سے پہلے اسی قسم کی مثالیں عبرت کے لئے موجود نہ تھیں بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ لوگوں کی عبرت کے لئے ان سے اس غلطی کے صدور کو روا رکھا ہو۔

ہمارے زمانہ میں بھی عام مسلمان باوجود پہلی قوموں میں عبرت کی مثالوں کے موجود ہونے کے اس قسم کے اجتہادوں سے دھوکا کھا رہے ہیں مثلاً تاجروں کو بعض علماء یہ دھوکا دیتے ہیں کہ سود جو اسلام نے منع کیا تھا وہ سود نہ تھا جو اب بنکوں کو دینا پڑتا ہے موجودہ سود سے بچنا تو قوم کو تباہ کرتا ہے اور اس سود کا لینا قوم کو تباہ کرتا تھا اس لئے اب بنکوں کا سود لینا منع نہیں بلکہ قومی زندگی کے لئے ضروری ہے اور کئی مسلمان جو دل سے اسلام کے احکام پر عمل کرنے کے خواہشمند ہیں اس دھوکے میں آکر سود لے رہے ہیں اسی طرح بعض لوگوں نے عورتوں کو دھوکا دیا ہے کہ عرب کا ملک جاہل تھا اور پردہ نہ کرنے کی وجہ سے اس وقت کی عورتیں گمراہ ہو سکتی تھیں لیکن اب تعلیم کا زمانہ ہے اب پردہ چھوڑنے میں حرج نہیں بلکہ مسلمان عورتوں کے باہر آنے میں اسلام کی مضبوطی ہے اور کئی عورتیں جو دل سے اسلام سے محبت رکھتی ہیں اس دھوکے میں آکر پردہ چھوڑ رہی ہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ وہ کیا امر تھا جس کے بارہ میں شیطان نے دھوکا دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت سے اس امر کو پوشیدہ رکھا ہے پس اجمالاً اس امر پر یقین رکھنا کافی ہے کہ ممنوع باتوں میں سے کسی ایک کو جس کے بارہ میں دھوکا لگ سکتا تھا شیطان نے پیش کیا اور اس کی نسبت یہ دھوکا دیا کہ حالات کے بدل جانے کی وجہ سے اب اس کا ترک دین کے لئے مضر ہے جس طرح کہ پہلے اس کا اختیار کرنا دین کے لئے مضر تھا ممکن ہے کہ اس وقت کے دشمنوں سے تعلقات پیدا کرنے کے متعلق ہی تحریک کی ہو جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے منافق کہا کرتے تھے۔ ہماری جماعت کو بھی اس بارہ میں ایک حصہ سے اس قسم کا تلخ تجربہ ہوا ہے اور حال کے زمانہ کی یہ دو مثالیں ہمیں اس طرف رہبری کرتی ہیں کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی شیطان نے کوئی ایسی ہی چال چلی تھی۔

شائد کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب اس امر کو جس کے بارہ میں شیطان نے آدم علیہ السلام کو دھوکا دیا تھا ظاہر نہیں کیا گیا تو (۱) اس سے ہم فائدہ کیا اٹھا سکتے ہیں (۲) دشمنانِ قرآن پر یہ مبہم بیان حجت کیونکر ہو سکتا ہے۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس واقعہ سے جس امر سے ہوشیار کرنا ہمیں مقصود ہے وہ صرف یہ ہے کہ کبھی دشمن نیکی کے جبہ میں آکر اور بُری بات کو نیک توجیہہ کے پردہ میں چھپا کر گمراہ کرنا چاہتا ہے مسلمانوں کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ یہ غرض اس مضمون سے روز روشن کی طرح واضح ہے باقی رہا یہ کہ آدم علیہ السلام کو کسی خاص امر میں شیطان نے دھوکا دیا تھا اس کا بیان کرنا ضروری نہیں کیونکہ ہر زمانہ میں شیطان نیا رنگ اختیار کرتا ہے اگر اس خاص امر کو بیان کر بھی دیا جاتا تو مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ ہو سکتا تھا جس قدر واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ مومنوں کو منافقوں کی چالبازیوں سے ہوشیار کرنے کے لئے کافی واضح اور بیّن ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ منکرین قرآن کے فائدہ اٹھانے کا یہاں سوال ہی نہیں قرآن کریم کی تعلیم دو حصوں پر مشتمل ہے (۱) وہ حصہ جو مومن و کافر سب کے لئے مشترک ہے (۲) وہ حصہ جو صرف مومنوں کے لئے نصیحت اور فائدہ کا موجب ہے جن حصص میں عقلی دلائل اور معجزات عامّہ اور مختلف مذاہب کی کتب کے نقلی دلائل بیان ہوئے ہیں وہ تو مومن و کافر یا مومنوں اور خاص خاص مذاہب کے کافروں کے لئے حجت ہیں اور جن حصوں میں خالص روحانی امور بیان ہوئے ہیں وہ صرف مومنوں کے لئے مفید ہیں اور کافروں کے لئے اسی وقت مفید ہو سکتے ہیں جب پہلے ان کے عقائد کی اصلاح ہو جائے اور یہ حصہ صرف مومنوں سے تعلق رکھتا ہے اس لئے کفار کو اگر اسکی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو کوئی اعتراض کی بات

اس سوال کا جواب کہ وہ امر کیا تھا جس کے بارہ میں شیطان نے دھوکہ دیا۔

مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

اپنے رب سے کچھ (دعائیہ) کلمات سیکھے (اور ان کے مطابق دُعا کی) تو وہ (یعنی اللہ) اس کی طرف (پھر فضل کے ساتھ) متوجہ ہوا یقیناً وہی (بندوں

الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

کی مصیبت کے وقت) بہت ہی توجہ کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۳۸؎ ہم نے کہا (جاؤ) اس میں سے سب کے سب نکل جاؤ (اور یاد رکھو کر)

نہیں جس طرح ایک دہریہ کی وجہ سے جو خدا تعالیٰ کو نہیں مانتا نبوت کے دلائل بیان کرنے سے رُکا نہیں جا سکتا اسی طرح جو لوگ کسی خاص نبی کو نہیں مانتے ان کی وجہ سے اس نبی کے اتباع کے فائدہ کی باتوں کے بیان کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔

کَلِمٰت ۲

لفظ اِهْبِطُوْا سے بعض لوگوں کا غلط استدلال اور اس کا صحیح مطلب۔

اِهْبِطُوْا کے لفظ سے دھوکا کھا کر بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آدم علیہ السلام آسمان پر تھے پھر انہیں زمین پر پھینکا گیا مگر جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے اس لفظ کے معنے چلے جانے کے بھی ہوتے ہیں اور اس امر کو دیکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین میں خلیفہ بنایا تھا اس جگہ اس کے یہی معنے ہیں قرآن کریم میں ان معنوں میں یہ لفظ دوسری جگہ پر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً بنی اسرائیل کی نسبت فرماتا ہے اِهْبِطُوْا مِصْرًا (بقرہ ع) شہر کی طرف چلے جاؤ یا شہر میں داخل ہو جاؤ۔

تَابَ ۲

تَلَقّٰی ۱

تَوّاب

الرَّحِیْم ۲

۳۸؎ حل لغات:۔ تَلَقّٰی، لَقِیَ سے باب تفعّل کا واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور تَلَقَّاهُ کے معنے ہیں اِسْتَقْبَلَهٗ اس کو آگے سے جا کر ملا۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ يَتَلَقّٰى فُلَانًا اَیْ يَسْتَقْبِلُهٗ فلاں شخص فلاں کو آگے سے جا کر ملتا ہے اور تَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ کے معنے ہیں اَخَذَهَا عَنْهُ کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کلمات لئے وَقِيْلَ تَعَلَّمَهَا بعض نے اس کا پورا مفہوم یوں ادا کیا ہے کہ انہوں نے سیکھے (لسان) اقرب میں لکھا ہے کہ تَلَقَّى الشَّيْءَ کے معنے ہیں لَقِيَهٗ کسی کو آگے جا کر ملا (کسی چیز کو آگے جا کر لیا) اور جب تَلَقَّى الشَّيْءَ مِنْهُ کہیں تو اس کے معنے ہونگے تَلَقَّنَهٗ

فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ سے مراد۔

کسی کے مُنہ سے کوئی بات بالمشافہ سن کر اخذ کی اور اس کو ضبط کر لیا (اقرب)۔ پس تَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ کے معنے ہوں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے کچھ دعائیہ کلمات بذریعہ الہام سیکھے۔

كَلِمٰتٌ:۔ كَلِمَةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں اللَّفْظَةُ مُنہ سے بولا ہوا مفرد لفظ وَكُلُّ مَا يَنْطِقُ بِهِ الْاِنْسَانُ مُفْرَدًا كَانَ اَوْ مُرَكَّبًا نیز ہر اس بات پر بھی جو انسان بولے خواہ وہ مفرد ہو یا مرکب كَلِمَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ كَلِمَةٌ کے ایک معنے اَلْخُطْبَةُ وَالْقَصِيْدَةُ کے بھی ہیں یعنی خطبہ اور قصیدہ (اقرب)

تَابَ:۔ تَابَ اِلَيْهِ وَعَلَيْهِ کے معنے ہیں رَجَعَ عَلَيْهِ بِفَضْلِهٖ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا (اقرب)

تَوَّابٌ:۔ تَوَّابٌ مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنے ہیں فضل کے ساتھ بہت متوجہ ہونے والا۔

اَلرَّحِيْمُ:۔ اس کے لئے دیکھو حل لغات سورہ فاتحہ ۲؎

تفسیر۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت آدم کو شیطان نے دھوکا دے دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی غلطی سے آگاہ کیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (اعراف ع) یعنی اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اور اگر تو ہماری غلطی کو معاف نہ فرمائے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ یہی دعا ہو

مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا

وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳۹ اور جو (لوگ) کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائینگے

نے سیکھی تھی۔

اس آیت میں ایک اور لطیف بات بتائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے رحم اور فضل کی جاذب زیادہ تر وہی دُعائیں ہوتی ہیں جو وہ خود سکھلاتا ہے بہت سے انسان اپنی طرف سے دُعائیں بناتے ہیں لیکن وہ ایسی ناقص اور لغو ہوتی ہیں کہ بعض اوقات وہ دُعاؤں کی بجائے بددُعاؤں کا مفہوم ادا کرتی ہیں اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے الفاظ میں دُعا مانگے ہی نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا مضبوط تعلق پیدا کرے کہ جب وہ کسی مصیبت یا مشکل میں گرفتار ہو تو آدم اور دوسرے بزرگوں کی طرح اللہ تعالیٰ خود ہی اسے وہ دعا سکھلا دے جس کے مانگنے سے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کو حاصل کر سکے۔

۳۹ حل لغات:۔ اِمَّا:۔ اِنْ اور مَا سے مرکب ہے (مغنی) اِنْ حرف شرط ہے۔ اور مَا تاکید کے لئے زائد لایا گیا ہے۔

هُدًی:۔ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ فاتحہ ۵ و سورہ ہذا ۳

خَوْفٌ:۔ خَوْفٌ کے معنے ہیں اِنْفِعَالٌ فِی النَّفْسِ یَحْدُثُ لِتَوَقُّعِ مَا یَرِدُ مِنَ الْمَكْرُوْهِ اَوْ یَفُوْتُ مِنَ الْمَحْبُوْبِ کسی آئندہ وقت میں کسی ناپسندیدہ امر کے وقوع پذیر ہونے یا کسی پسندیدہ چیز کے ہاتھ سے چلے جانے کے خیال سے جو طبیعت پر گھبراہٹ طاری ہوتی ہے اسے خوف کے نام سے موسوم کرتے ہیں (اقرب)

یَحْزَنُوْنَ:۔ حَزِنَ (یَحْزَنُ) حَزَنًا سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور حَزِنَ لَهٗ وَعَلَیْهِ کے معنے ہیں ضِدَّ سَرَّ غمگین ہوا (اقرب) اَلْحُزْنُ کے معنے ہیں اَلْغَمُّ غم دا اندوہ خِلَافُ السُّرُوْرِ خوشی کے متضاد معنے دیتا ہے یعنی غمگینی۔ نیز لکھا ہے کہ اَلْحُزْنُ الْغَمُّ الْحَاصِلُ لِوَقُوْعِ مَكْرُوْهٍ اَوْ فَوَاتِ مَحْبُوْبٍ فِی الْمَاضِیْ زمانہ ماضی میں کسی ناپسندیدہ امر کے وقوع پذیر ہونے یا کسی پسندیدہ چیز کے ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے جو طبیعت میں افسوس پیدا ہوتا ہے اُسے حُزن کے نام سے تعبیر کرتے ہیں (تاج) مفردات راغب میں ہے اَلْحُزْنُ:۔ خُشُوْنَةٌ فِی النَّفْسِ لِمَا یَحْصُلُ فِیْهِ مِنَ الْغَمِّ دل کی بیقراری جو غم کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے وَیُضَادُّهُ الْفَرَحُ اور اس کے بالمقابل فرح کا لفظ بولا جاتا ہے (مفردات) خوف اور حُزن میں یہ فرق ہے کہ خوف آئندہ زمانے کے متعلق ہوتا ہے اور حُزن کسی گذشتہ واقعہ کی بنا پر ہوتا ہے۔

اِمَّا

هُدًی

خَوْفٌ

یَحْزَنُوْنَ

قَتَابَ عَلَیْهِ میں اس طرف اشارہ کہ خدا تعالیٰ کے رحم کی جاذب زیادہ تر وہی دُعائیں ہوتی ہیں

تفسیر۔ اس آیت میں اِهْبِطُوْا جمع کا لفظ ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس جنت میں صرف آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی نہ تھے بلکہ آدم کے اتباع بھی تھے۔

اس آیت میں وعدہ کیا گیا ہے کہ آدم کی اولاد میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو لوگوں کو نیکی اور ہدایت کی طرف بلاتے رہیں گے اور ایسے لوگ جو ہدایت کو مان لینگے وہ اسی دنیا میں جنت میں آجائینگے یعنی ان کے دلوں میں ایسی ایمانی قوت پیدا ہو جائیگی کہ ہر حالت میں ان کے دل مطمئن رہیں گے اور خوف یعنی آئندہ نقصانات کا ڈر اور حُزن یعنی

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کہ آدم کی اولاد میں ہادی پیدا ہوتے رہیں گے۔

ع بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

وہ دوزخ (میں پڑنے) والے ہیں اور وہ اس میں بستے رہیں گے ۳۹

پچھلے نقصانات پر افسوس ان کو غمگین نہ کریگا بلکہ ان کا
وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کی تشریح۔ دل جنت کا قائم مقام ہو جائے گا اور مابعد الموت الٰہی انعامات
کے وارث ہوں گے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام کے بعد وحی کا سلسلہ ختم نہیں ہو گیا بلکہ اسی وقت سے اللہ تعالےٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ آیندہ بھی وحی الٰہی آتی رہے گی اور اس کے ماننے والوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل نازل ہوتے رہیں گے۔

كَذَّبُوْا ۵۴ **حل لغات**۔ كَذَّبُوْا:۔ كَذَّبَ سے جمع کا صیغہ ہے۔ اور كَذَّبَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ كَاذِبًا وَنَسَبَهٗ اِلَى الْكِذْبِ اُسے جھٹلایا۔ اور اس کی نسبت جھوٹ کی طرف کی۔ وَقِيْلَ قَالَ لَهٗ كَذَبْتَ اور بعض نے کہا ہے کہ كَذَّبَ کے معنے ہیں کسی کو یہ کہا کہ اس نے جھوٹ بولا ہے اور جب كَذَّبَ بِالْاَمْرِ تَكْذِيْبًا وَكِذَّابًا کا فقرہ بولیں تو معنے یہ ہونگے اَنْكَرَهٗ وَجَحَدَهٗ کہ کسی معاملہ کا انکار کیا (اقرب) پس كَذَّبُوْا کے معنے ہونگے انہوں نے جھٹلایا۔

اٰيٰتٌ اٰيٰتٌ:۔ اٰيَةٌ کی جمع ہے اور اٰيَةٌ کے معنے
واقعہ آدم میں ہر ایک مسلمان کے لئے نصیحت۔ علامت۔ نشان اور دلیل کے ہوتے ہیں نیز قرآن کریم کے ہر ایسے ٹکڑے کو جسے کسی لفظی نشان کے ساتھ دوسرے سے جدا کر دیا گیا ہو اٰيَةٌ کہتے ہیں۔ (تاج)

خٰلِدُوْنَ خٰلِدُوْنَ:۔ کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۲۶۔

تفسیر۔ یعنی جو لوگ ہدایت کو چھوڑ کر ان نشانوں کا انکار کریںگے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی شناخت کے لئے اس وقت پیدا کئے ہونگے وہ ایک آگ میں پڑ جائیںگے۔ اور دلی اطمینان اور قلبی راحت ان کو حاصل نہ ہوگی خواہ بظاہر ہزاروں نعمتوں میں گھرے ہوئے ہوں اور مابعد الموت سزاؤں کے وارث ہوں گے۔

وَهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ خُلود کے معنے ہیں ایک لمبا عرصہ رہنا۔ دیکھو کلیات ابی البقاء وَفِي الْاَصْلِ اَلثَّبَاتُ الْمَدِيْدُ دَامَ اَمْ لَمْ يَدُمْ یعنی خُلُود کے اصل معنے ایک لمبا عرصہ تک رہنے کے ہیں خواہ ہمیشہ رہیں یا نہ رہیں یہ معنے نہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اسلام دائمی عذاب کا قائل نہیں۔ بلکہ دوزخ کو ایک شفاخانہ کی طرح قرار دیتا ہے جس میں لوگ صرف اصلاح کے لئے داخل کئے جائیںگے اسلام کا خدا غیظ اور کینہ کے طور پر انتقام نہیں لیتا بلکہ وہ سزا کی یہ وجہ بیان فرماتا ہے کہ انسان کی اصلاح ہو جائے جب یہ بات حاصل ہو جاتی ہے تو عذاب ٹل جاتا ہے اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ پر ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس میں کوئی بھی دوزخی نہ رہے گا اور نسیم اس کے دروازے ہلائیگی۔ (تفسیر معالم التنزیل سورۃ ہود زیر آیت اَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا)

گو یہ واقعہ کسی پچھلے زمانہ میں انسانی نسل کے کسی خاص جد کے ساتھ بھی گزرا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے بیان فرمانے میں ایک ایسا رنگ اختیار کیا ہے جس سے ہر ایک مسلمان نصیحت حاصل کر سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سی باتوں کا ذکر بطور قصہ کے نہیں کیا بلکہ ایسے الفاظ میں ان کو ظاہر کیا ہے کہ جنہیں ہر انسان اپنے پر چسپاں کر سکے مثلاً یہ کہ اسماء کی نسبت نہیں بتایا کہ وہ کیا تھے نہ شجرہ کی نسبت بیان کیا کہ وہ کونسا تھا پھر جہاں آدم کو بہکانے والے کا ذکر ہے وہاں ابلیس کی جگہ شیطان کا لفظ رکھ کر بتا دیا ہے کہ ابلیس کے اضلال چاروں طرف موجود ہیں تا یہ واقعہ لوگوں کے لئے نصیحت اور فائدہ کا موجب ہو اور ایسا نہ ہو کہ وہ ایک قصے کے طور پر اسے پڑھیں۔ ہر ایک انسان جو پیدا ہوتا ہے وہ آدم ہے ملائکہ کو جو دنیا کے رُوحانی نظم ونسق کو قائم

رکھنے کے لئے ایک واسطہ کے طور پر پیدا کئے گئے ہیں انہیں اس کی مدد کرنے کا حکم دیا جاتا ہے ملائکہ جن اشیاء کے نگران ہیں وہ سب انسان کی مدد کرتی اور اس کی زندگی کو بآرام بنانے میں کار آمد ہوتی ہیں لیکن بعض شریر لوگ دوسرے بھائیوں کا سکھ نہیں دیکھ سکتے وہ شیطان بنکر ان کو اس رُوحانی جنت سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ہر ایک انسان کو اس کی پیدائش سے ملا ہے اور بہت کچھ دُکھ دیتے ہیں۔ لیکن وہ جو آدم کی طرح اپنے رب کے حضور جھکتا ہے اور اس سے اپنی مصیبت کے دُور کرنے کی التجا کرتا ہے آخر کامیاب ہو جاتا ہے اور ہر خوف و حزن کی حد سے باہر نکل جاتا ہے لیکن جو لوگ آدم کے نقش قدم پر نہیں چلتے بلکہ ابتلاؤں میں اُن کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں اور شیطان سے صلح کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو رد کر دیتے ہیں وہ دُکھ میں پڑ جاتے اور ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک سورج جو چڑھتا ہے اس واقعہ کو بار بار دُہرا رہا ہے لیکن نادان انسان جو خود ہزاروں خطرناک بدیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ آدم پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ اس نے شیطان کا کہنا کیوں مانا۔ حالانکہ آدم بھُول کر ایک غلطی کا مرتکب ہوا تھا اور یہ معترض اپنے دل میں شیطان کو لئے بیٹھا ہوتا ہے اور آدم پر اعتراض کرتے ہوئے نہیں شرماتا ۔ بعض مفسرین نے اصل حقیقت سے قطع نظر کر کے اس جگہ عجیب عجیب قصے بیان کئے ہیں جنکی صحت کا ثبوت نہ قرآن مجید سے ملتا ہے نہ احادیث صحیحہ سے پس انکی طرف توجہ نہیں ہونی چاہیئے اور نہ غیر مذاہب کی طرف سے انکی بنا پر کوئی اعتراض قرآن مجید پر آ سکتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ سے علاوہ انسان کو اس کے ذاتی حالات کی طرف توجہ دلانے کے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی طرف بھی لطیف طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ (۱) الہام الٰہی ہی انسانی برتری کا ذریعہ ہے۔ بشر کو دوسرے حیوانات پر فضیلت الہام الٰہی کے ذریعہ سے ہی ملی پس جو اقوام الہام الٰہی سے محروم ہیں یا اس کی قدر نہیں کرتیں وہ حیوانیت کو انسانیت پر ترجیح دینے کی مجرم ہیں۔ اور تمدنی ترقی کے راستہ میں روک ثابت ہو رہی ہیں اور ہونگی۔ وہی لوگ تمدنی ترقی کا موجب ہوتے ہیں جو آسمانی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک کہنے والے ایک جدید اور مفید تمدن کی بنیاد رکھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اللہ تعالیٰ کی قدیم سنت کے مطابق اس جدید رُوحانی سلسلہ کے تبع ایک جدید اور عظیم الشان تمدن کے بانی ہوئے موجودہ مغربی تمدن گو بہت شاندار نظر آتا ہے مگر وہ بہت حد تک اسلامی تمدن کا خوشہ چین ہے اور جس حد تک وہ اس کے خلاف چلا ہے امن کا موجب نہیں ہوا۔ بلکہ فساد اور خونریزی کا موجب ہوا ہے (۲) جب بھی کوئی نئی اصلاح دنیا کے لوگوں کے سامنے آتی ہے دنیا اسکی مخالفت کرتی ہے وہ ایسی عظیم الشان ہوتی ہے کہ شروع شروع میں نیکوکار بھی اسکی گہرائیوں اور تاثیروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسلام کے ظہور کے وقت میں ایسا ہی ہونا لازمی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا (۳) نیک لوگ بعد میں اپنی غلطی تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کی عظمت کے قائل ہو جاتے اور اس کی تائید میں لگ جاتے ہیں لیکن شریر مخالف مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی اسلام سے ہوا اور ہوگا چنانچہ تمام نیک فطرت لوگ ایک ایک کر کے اسلام میں داخل ہوئے اور اس کی تائید میں لگ گئے لیکن ابلیس مزاج نافرمانی پر اُتر آئے (۴) جب ظاہری مخالفت ناکام رہتی ہے تو الٰہی سلسلوں کے دشمن ان میں شامل ہو کر ان کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ آدم کے وقت میں شیطان نے کیا اور ایسا ہی معاملہ اسلام سے وہ کرینگے اور کر رہے ہیں لیکن جس طرح آدم کا شیطان ناکام رہا اور حقیقی نقصان آدم علیہ السلام کو نہ پہنچا سکا۔ یہ منافق بھی اسلام کو کوئی حقیقی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور باوجود ان کی مخالفت کے اسلام ترقی کرے گا اور اس کے دشمن ایک دائمی عذاب میں مبتلا ہونگے (۵) الٰہی ہدایت کا سلسلہ محدود نہیں ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ ہدایت بھجواتا رہے گا اگر ہدایت کا سلسلہ

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں آنحضرت صلعم کے دعویٰ کی طرف لطیف طور پر توجہ کا مبذول کرانا۔

يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ اَنْعَمْتُ

اے بنی اسرائیل میرے اس احسان کو یاد کرو جو میں تم پر کر چکا ہوں

عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ

اور (تم نے) میرے (ساتھ جو) عہد (کیا تھا اس) کو پورا کرو تب (میں نے) تمہارے (ساتھ جو) عہد (کیا تھا اس) کو میں پورا

فَارْهَبُوْنِ ○ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

کرونگا اور مجھ (ہی) سے ڈرو پھر (میں کہتا ہوں کہ) مجھ (ہی) سے ڈرو ۴۱ اور اس کلام پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) اُتارا ہے

محدود ہوتا تو پھر اسے پہلے نبی کے ساتھ ہی بند ہو جانا چاہیئے تھا جیسا کہ مثلاً ہندوؤں کا خیال ہے لیکن وہ آدم اوّل کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ آدم اوّل کے مُنہ سے اللہ تعالیٰ نے آیندہ ہدایتوں کے آنے کی خبر دی۔ پس آیندہ کسی وقت میں اس کا بند ہو جانا خلافِ عقل و خلافِ وحیٔ الٰہی ہے (۶) جو لوگ آسمانی ہدایت پر ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ان کی سابق خطاؤں کے بد اثرات سے بچا لیتا ہے جیسا کہ آدم علیہ السلام سے ہوا اور آیندہ کا ہر قدم ان کا ایسا مضبوط پڑتا ہے کہ مستقبل کے خطرات کم ہوتے ہوتے بالکل مٹ جاتے ہیں پس خدا تعالیٰ کے اس وعدہ پر ایمان رکھتے ہوئے مومن دلیر بہادر اور جری ہوتا ہے وہ قربانیوں کے وقت عواقب اور انجام سے نہیں ڈرتا کیونکہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اس کے لئے ایسا عُروہ وُثقیٰ ہے کہ اسے پکڑنے کے بعد وہ ہر دُکھ سے محفوظ ہو گیا اگر وہ جیتا رہا تو دنیا کا رہنما ہو گا اگر مارا گیا تو خدا تعالےٰ کی محبت بھری گود میں۔ پس اسے کس امر کا خوف ہو سکتا ہے؟

بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ

۴۱ حل لغات:- بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ:- اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جو بائبل کے بیان کے مطابق ان کو ان کی بہادری کی وجہ سے خدا تعالےٰ کی طرف سے ملا۔ تورات میں آتا ہے "کہ تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہو گا کیونکہ تُو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔" (پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۸) عبرانی کی

لغت

ANALYTICAL HEBREW
AND CHALDEC

میں لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لقب کے علاوہ ان کی نسل پر (بھی) یہ لفظ بولا جاتا ہے یعنی کبھی بنی اسرائیل کو خالی اسرائیل بھی کہہ دیتے ہیں۔ عربی اسرائیل کا عبرانی تلفظ یَشْرَاِئیل ہے اور یہ مرکب ہے یسر اور ایل سے۔ یسر کے معنے ہیں جنگجو بہادر سپاہی۔ اور ایل کے معنے ہیں خدا۔ پس یسرائیل کے معنے ہوئے خدا کا بہادر سپاہی

WARRIOR OR
SOLDIER OF GOD

عربی زبان کے لحاظ سے یہ لفظ اِسْر اور اِیْل سے مرکب ہے گو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلیۃً عبرانی لفظ ہو اور عربی میں مستعار طور پر استعمال ہوتا ہو لیکن عربی زبان اور عبرانی زبان درحقیقت ایک ہی ہیں اور ہماری تحقیق میں عبرانی زبان عربی کی بگڑی ہوئی صورت ہے یورپین مصنفوں میں سے بھی بعض اس خیال کے ہیں گو اکثر مذہبی تعصب کی وجہ سے ان دونوں زبانوں کو ایک اور زبان کی شاخ ہی قرار دیتے ہیں بلکہ بعض تو عربی کو عبرانی کی شاخ تک قرار دے دیتے ہیں لیکن یہ موقعہ اس بحث کا نہیں اس موقعہ کے مناسب حال اس قدر کہنا کافی ہے کہ عربی اور عبرانی کا اشتراک ایک مسلّمہ حقیقت ہے اسے مدّنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں عربی ہے اور عبرانی زبان میں اس کی شکل بدل گئی ہے اور ہمزہ نے یار کی شکل اختیار کر لی ہے عربی

زبان میں اَسَرَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں قَبَضَ عَلَيْهِ وَ آخَذَهٗ (اقرب) یعنی فلاں شخص اپنے مدمقابل پر غالب آگیا اور اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان معنوں کے اعتبار سے اِسْر کے معنے ہونگے وہ شخص جس کے اندر بہادری اور قوت ہو اور وہ اپنے مدمقابل پر غلبہ پاکر اسے اپنی گرفت میں لے لے۔ اگر عبرانی کے تلفظ اور رسم الخط کو دیکھا جائے تو یَسْر کے معنے ہیں اَللِّيْنُ وَ الْاِنْقِيَادُ (لسان) کسی کی بات کو آسانی سے قبول کرلینا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا۔

لفظ اِیْل عربی زبان میں خدا تعالیٰ کے معنوں میں نہیں آتا۔ ہاں اگر غور کیا جائے تو اس کے حقیقی معنے اللہ تعالیٰ پر ہی صادق آتے ہیں کیونکہ یہ آلَ سے بنا ہے اور آلَ کا اسم فاعل آئِلٌ بنتا ہے اور اِیْل اس سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے آلَ کے معنے ہیں سَاسَ یعنی اس نے نگہداشت کی۔ چنانچہ کہتے ہیں آلَ الرَّجُلُ اَهْلَهٗ اَیْ سَاسَهُمْ کہ فلاں شخص نے اپنے کُنبہ کی پُوری نگہداشت کی (اقرب) نیز کہتے ہیں آلَ الْمَلِكُ الرَّعِيَّةَ کہ بادشاہ نے اپنی رعیت کی نگرانی رکھی اور رعیت کے ساتھ تعلق رکھنے والے امور کی تدبیر کی۔ نیز کہتے ہیں آلَ عَلَى الْقَوْمِ۔ وَلِیَ کہ وہ قوم پر بادشاہ ہوگیا۔ پس آئِلٌ کے معنے ہوئے مدبر۔ حاکم۔ بادشاہ۔ اور اِیْلٌ کے معنے ہونگے ایسی ہستی جس کی ذات میں تدبیر امور اور حکومت اور بادشاہت کی صفات پائیداری کے ساتھ پائی جاتی ہیں اور یہ صفات سوائے خدا تعالیٰ کے کسی اور ذات میں نہیں پائی جاتیں۔ کیونکہ وہی ایک ذات ہے جو ازلی اور ابدی ہے۔ آلَ کے ایک معنے لوٹنے کے ہیں ان معنوں کے لحاظ سے اِیْل کے معنے ہونگے کہ وہ ذات جس کے اندر لوٹنے کی صفت پائیداری اور ہمیشگی کے ساتھ پائی جاتی ہے اور یہی معنے بلفظ دیگر تَوَّابٌ کے ہیں یعنی بار بار رحمت کے ساتھ اپنے بندوں پر لوٹنے والا۔

الغرض پہلے مادہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسرائیل کے معنے مندرجہ ذیل ہونگے (۱) ازلی ابدی بادشاہ (یعنی خدا تعالیٰ) کا سخت گرفت رکھنے والا بندہ (۲) ازلی ابدی مدبر ہستی کا سخت گرفت رکھنے والا بندہ (۳) بار بار لوٹنے والے کا (یعنی تواب خدا کا) بہادر بندہ۔

دوسرے مادہ یعنی یَسْر کے لحاظ سے اسرائیل کے معنے ہونگے اللہ تعالیٰ کا پورا مطیع و فرمانبردار اور اس کے اخلاق کو اپنے اندر لینے والا۔ عبرانی زبان چونکہ عربی سے نکلی ہے اس لئے اگرچہ اسرائیل کا تلفظ عبرانی میں بدل گیا اور اِسْر کو یَسْر اور اِیْل کو ایل (نرم زبان سے یعنی زبر اور زیر کے درمیانی تلفظ سے) کر دیا گیا اور عربی زبان جو کہ اپنے اصل معنے کا انکشاف کرتی ہے عبرانی نے اسے محدود کر دیا۔ کیونکہ عبرانی میں اسرائیل کے معنے صرف خدا کے جنگجو بہادر سپاہی کے ہیں لیکن عربی زبان میں جہاں یہ معنے بھی بالوضاحت پائے جاتے ہیں وہاں ایک اور معنے کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ یہ لفظ یَسْر سے بھی صفت مشبہ کا صیغہ بن سکتا ہے اور یہ لفظ اس خاص حالت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انبیاء کی فطرت میں پائی جاتی ہے یعنی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے لئے سرِ تسلیم خم رکھنا۔ گویا اسرائیل اس شخص کو کہیں گے جو اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کے احکام کے ماننے کے لئے ہر وقت اپنے تئیں تیار رکھے۔ ان معنوں کی تصدیق تاج العروس والے نے بھی کی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ مَعْنَاهُ صَفْوَةُ اللّٰهِ وَقِيْلَ عَبْدُ اللّٰهِ کہ اسرائیل کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ کیا ہوا اور اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کے احکام کا فرمانبردار۔ بعض لوگوں نے اس کے معنے سَرِيُّ اللّٰهِ کے کئے ہیں (تاج) سَرِیٌّ کے معنے عربی زبان میں صاحب شرف و مروت اور فیاض کے یا معزز شریف سردار کے ہیں لیکن

HEBREW AND ENGLISH
LAXICON OF THE OLD
TESTAMENT

میں اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ یَسْر کے حقیقی معنے

مَسِیْحٌ کے نہیں ہاں اس سے ملتا جلتا مفہوم ہے (اصل بات یہ ہے کہ بَشَرٌ چونکہ جنگجو بہادر کو کہتے ہیں اور ایسا شخص ہی سردارِ لشکر ہو سکتا ہے جو بہادر اور جنگجو ہو اور عرب لوگ بھی ایسے شخص کو سردار مانتے تھے جو صاحبِ شرف اور مروّت اور فیاض ہو اور ایسا شخص ہی جنگوں میں پیشرو ہو سکتا تھا تو گویا ان معنوں کے لحاظ سے بَشَرٌ کے معنے مَسِیْحٌ کے مشابہ ہو گئے)۔

اُذْكُرُوْا

نِعْمَتِيَ

اُذْكُرُوْا:۔ امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور ذَكَرَ الشَّيْءَ (يَذْكُرُ ذِكْرًا وَتَذْكَارًا) کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں یاد کر لیا اور جب ذَكَرَ الشَّيْءَ بِلِسَانِهٖ کہیں تو معنے ہونگے قَالَ فِيْهِ شَيْئًا کہ اس نے کسی بات کے متعلق اپنی زبان سے کچھ کہا اور ذَكَرَ لِفُلَانٍ حَدِيْثًا کے معنے ہیں قَالَهٗ لَهٗ کوئی بات بیان کی جب ذَكَرَ مَا كَانَ قَدْ نَسِيَ کا فقرہ بولیں تو اس کے معنے ہونگے فَطَنَ بِهٖ کسی بھولی ہوئی بات کی یاد تازہ ہو گئی (اقرب) امام راغب لکھتے ہیں اَلذِّكْرُ تَارَةً يُقَالُ وَيُرَادُ بِهٖ هَيْئَةٌ لِلنَّفْسِ بِهَا يُمَكِّنُ لِلْاِنْسَانِ اَنْ يَحْفَظَ مَا يَقْتَنِيْهِ مِنَ الْمَعْرِفَةِ کہ ذکر کا لفظ بول کر کبھی نفس کی وہ ہیئت مراد لی جاتی ہے جس کے ذریعہ سے انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ معلوم شدہ باتوں کو یاد رکھ سکے وَهُوَ كَالْحِفْظِ اِلَّا اَنَّ الْحِفْظَ يُقَالُ اعْتِبَارًا بِاِحْرَازِهٖ وَالذِّكْرُ يُقَالُ اعْتِبَارًا بِاِسْتِحْضَارِهٖ۔ اور ان مذکورہ بالا معنوں میں ذکر کا لفظ حفظ کے لفظ کے ہم معنی ہے ہاں حفظ اور ذکر ہر دو کے مفہوم میں تھوڑا سا امتیاز ہے حفظ کسی شخص کے یاد کرنے پر اس وقت بولیں گے جب وہ ذہن میں بعض باتوں کو جمع کرتا چلا جائے اور ذکر اس کے اس طور پر یاد رکھنے کو کہیں گے کہ اس کو وہ باتیں مستحضر رہیں اور جب چاہے انہیں استعمال کر لے وَتَارَةً يُقَالُ لِحُضُوْرِ الشَّيْءِ [illegible] الْقَلْبِ اَوِ الْقَوْلِ اور کبھی دل میں کسی امر کا [illegible] سے لانے کا نام ذکر رکھا جاتا ہے وَلِذٰلِكَ قِيْلَ اَلذِّكْرُ ذِكْرَانِ ذِكْرٌ بِالْقَلْبِ وَذِكْرٌ بِاللِّسَانِ اسی لئے کہتے ہیں کہ ذکر دو طرح ہوتا ہے (۱) قلبی ذکر (۲) زبانی ذکر وَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا ضَرْبَانِ ذِكْرٌ عَنْ نِسْيَانٍ وَذِكْرٌ لَا عَنْ نِسْيَانٍ بَلْ عَنْ اِدَامَةِ الْحِفْظِ کہ خواہ قلبی ذکر ہو یا قولی ہر دو کی دو دو قسمیں ہیں (۱) بھول جانے کے بعد کسی بات کا یاد کرنا (۲) یا بغیر بھولنے کے یاد رکھنا (مفردات) پس اُذْكُرُوْا کے معنے ہونگے۔ تم یاد کرو۔

نِعْمَتِيَ:۔ اَلنِّعْمَةُ کے معنے ہیں اَلصَّنِيْعَةُ وَالْمِنَّةُ احسان۔ مَا اُنْعِمَ بِهٖ عَلَيْكَ مِنْ رِزْقٍ وَمَالٍ وَغَيْرِهٖ۔ وہ مال یا رزق یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز جو بطور انعام ملے۔ اَلْمَسَرَّةُ خوشی۔ اَلْيَدُ الْبَيْضَاءُ الصَّالِحَةُ ایسا احسان جس میں کوئی کدورت اور کمی نہ ہو۔ وَفِي الْكُلِّيَّاتِ اَلنِّعْمَةُ فِيْ اَصْلِ وَضْعِهَا "اَلْحَالَةُ الَّتِيْ يَسْتَلِذُّ بِهَا الْاِنْسَانُ" وَهٰذَا مَبْنِيٌّ عَلٰى مَا اشْتَهَرَ عِنْدَهُمْ مِنْ اَنَّ النِّعْمَةَ بِالْكَسْرِ لِلْحَالَةِ وَبِالْفَتْحِ لِلْمَرَّةِ۔ اور کلیات ابی البقاء میں یوں لکھا ہے کہ نعمت اصل وضع کے لحاظ سے اس حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان لذت اٹھاتا ہے اور یہ اس بنا پر ہے کہ حالت بیان کرنے کے لئے عربی زبان میں فِعْلَةٌ اور کسی کام کے ایک دفعہ ہونے کا اظہار کرنے کے لئے فَعْلَةٌ کا وزن لاتے ہیں اور نِعْمَةٌ ن کی زیر سے چونکہ فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے اس لئے اس میں نعمت والی حالت کے معنے پائے جاتے ہیں۔ وَنِعْمَةُ اللّٰهِ۔ مَا اَعْطَاهُ اللّٰهُ لِلْعَبْدِ مِمَّا لَا يَتَمَنّٰى غَيْرَهٗ اَنْ يُعْطِيَهٗ اِيَّاهُ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اپنے بندے پر وہ احسان ہے جس کے بعد بندہ اس کے متعلق کسی اور سے خواہش نہیں رکھتا۔ اس کی جمع اَنْعُمٌ اور نِعَمٌ آتی ہے اور جب فُلَانٌ وَاسِعُ النِّعْمَةِ کہیں تو اس کے معنے ہونگے وَاسِعُ الْمَالِ یعنے فلاں مالدار ہے (اقرب)

اَلْعَھْدُ:۔ کے مصدری معنے ہیں حِفْظُ الشَّیْءِ وَمُرَاعَاتُہٗ حَالًا بَعْدَ حَالٍ کسی چیز کی حفاظت کرنا اور وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ وَسُمِّیَ الْمَوْثِقُ الَّذِیْ یَلْزَمُ مُرَاعَاتُہٗ عَھْدًا۔ اور اس عہد و پیمان کو جسکی ہر لحاظ سے حفاظت کی جائے عہد کے نام سے موسوم کرتے ہیں وَعَھْدُ اللّٰہِ تَارَۃً یَکُوْنُ بِمَا رَکَزَہٗ فِیْ عُقُوْلِنَا اور اللہ تعالیٰ کا بندوں سے عہد تین طور پر ہے (۱) یہ کہ بعض باتیں اس نے فطرت انسانی میں رکھ دی ہیں اور اس عہد کی حفاظت اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ خلاف فطرت کام نہ کیا جائے (۲) وَتَارَۃً یَکُوْنُ بِمَا اَمَرَنَا بِہٖ بِالْکِتَابِ وَبِسُنَّۃِ رُسُلِہٖ اور کبھی اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے عہد لینے سے یہ مُراد ہوتی ہے کہ وہ باتیں جو اس نے اپنی نازل کردہ کتاب اور اپنے رسولوں کی سنّت کے ذریعہ ہمارے پاس بھیجی ہیں ہم ان کو بجالائیں (۳) وَتَارَۃً بِمَا نَلْتَزِمُہٗ بعض اوقات اس بات کو بھی عہد کہہ دیتے ہیں جو برضا و رغبت اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے ذمہ لگا لیا جائے کہ مَیں خدا تعالیٰ کی خاطر فلاں جائز کام ضرور کرونگا (مفردات)

تاج العروس میں ہے اَلْعَھْدُ اَلْوَصِیَّۃُ وَالْاَمْرُ کہ عہد کے معنے کسی تاکیدی حکم کے ہوتے ہیں نیز اس کے معنے ہیں اَلْمَوْثِقُ وَالْیَمِیْنُ پکا عہد و پیمان۔ قسم۔ اَلْحِفَاظُ وَرِعَایَۃُ الْحُرْمَۃِ کسی بات کی حفاظت اور اسکی حرمت کی نگہداشت کرنا۔ اَلْاَمَانُ امان۔ اَلذِّمَّۃُ ذمہ۔ اَلْاِلْتِقَاءُ بلند ملاقات۔ اَلْمَعْرِفَۃُ کسی چیز کو جاننا اَلزَّمَانُ۔ زمانہ۔ اَلْوَفَاءُ وفا۔ تَوْحِیْدُ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ اللہ تعالیٰ کو واحد گرداننا اَلضَّمَانُ۔ ضمانت۔ اَلَّذِیْ یُکْتَبُ لِلْوُلَاۃِ۔ پروانہ شاہی جو کسی شخص کو کسی مُلک کا حاکم مقرر کرتے وقت لکھ کر دیا جاتا ہے (تاج)

اِرْھَبُوْنِ:۔ اِرْھَبُوْا جمع مخاطب کا صیغہ امر ہے اور رَھِبَ الرَّجُلُ (یَرْھَبُ رَھْبَۃً) کے معنے ہیں خَافَ ڈر گیا (اقرب) اِرْھَبُوْنِ اصل میں اِرْھَبُوْنِیْ تھا۔ ی کو گرا دیا گیا اور نون وقایہ کے کسرہ پر اکتفا کیا گیا۔ اِرْھَبُوْنِ کے معنے ہیں۔ مجھ سے ڈرو۔ ١ اَلْعَھْد

تفسیر۔ ترتیب مضمون:۔ آدم علیہ السلام کی مثال دیکر یہ بتایا گیا تھا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوٰی کوئی نیا دعوٰی نہیں بلکہ جب بشر کی عقل مکمل ہوئی اسی وقت اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر الہام نازل کیا تھا اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب شروع میں الہام نازل کر دیا تو پھر اور کسی الہام کی کیا ضرورت ہے کیا وہ الہام کافی نہیں۔ یہ سوال عام ہے اور اکثر نبوت کے مخالف بلکہ پُرانے مذہب کے مدعیان بھی یہ اعتراض کرتے چلے آئے ہیں۔ مخالفین نبوت کے اعتراض کی غرض تو صرف نبوت میں شک پیدا کرنا ہوتی ہے وہ اس اعتراض سے صرف یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ موجودہ مدعی غلطی پر ثابت ہوگا سابق کا کوئی دعویدار اور نائب موجود ہی نہیں کہ اسکی اطاعت کا سوال ہو لیکن جو مذاہب قدیم ہیں ان کی غرض اس سوال سے یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مذہب کی موجودگی میں اور کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ اس سوال کا دو طرح جواب دیا جا سکتا ہے ایک اس طرح کہ عقلاً نبوت کی ضرورت ثابت کی جائے دوسرے اس طرح کہ واقعات کی شہادت سے ثابت کر دیا جائے کہ نبوت آدم علیہ السلام کے بعد بھی جاری رہی۔ قرآن کریم نے نبوت کے اجراء کی ضرورت کو عقلی طور پر کئی دوسرے مقامات پر ثابت کیا ہے مگر اس جگہ دوسرے طریق جواب کو اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کے قریب زمانہ تک نبوۃ کے مدّعی ہوتے رہے ہیں پس یہ کہنا کہ پہلی شریعت کے بعد اور کسی شریعت یا وحی نبوت کی ضرورت نہیں درست نہیں جن لوگوں کی صداقت شواہد اور دلائل سے ثابت ہو چکی ہو ان کے دعوٰی کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر وہ اپنے دعوٰی میں سچے تھے تو پہلی وحی کے بعد دوسرے زمانوں کی وحیوں کا انکار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر پہلی وحی کے بعد بھی الہام ہوتا رہا بلکہ اسلام کے قریب زمانہ تک بھی خدا تعالیٰ

٢ ترتیب مضمون

٣ اِرْھَبُوْن

کے نبی آتے رہے تو پھر اسلام کی وحی پر اس بنار پر اعتراض کرنا کہ پہلی وحی کے بعد دوسری وحی کی ضرورت نہیں کس طرح درست ہوسکتا ہے؟

اس طریق جواب کو اختیار کرنے میں ایک مزید فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے پہلے مخاطبین میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو یہودی مذہب یا عیسوی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور انہی کے نبیوں کو قرآن کریم نے وحی کے جاری ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی جس کے بغیر ان پہلے نبیوں کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ بنو اسمٰعیل میں ایک نبی کا وجود بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے یہ خبر دی گئی تھی کہ بنو اسماعیل میں بھی ایک نبی ہوگا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے نبیوں نے اس نبی کی آمد کی مزید وضاحت کی تھی پس ان انبیار کی وحی کو بطور شہادت پیدا کرنے میں دو فائدے تھے ایک تو وحی کے اجرار کا ثبوت دوسرے اس امر کا ثبوت کہ اس سلسلۂ نبوت کے بعد وحی الٰہی کا بنو اسماعیل کی طرف منتقل ہونا لازمی اور ضروری تھا پس وحی نبوت کا اجرار ہی ثابت نہیں بلکہ اس کا آخری زمانہ کے مورد کا بنو اسمٰعیل اور عرب میں ہونا بھی ضروری تھا۔

آدم علیہ السلام کا وقعہ بیان کرنے کے بعد بنو اسرائیل کو مخاطب کرنے کی وجہ۔

لفظ اسرائیل کے معنی

چنانچہ اس دلیل کو بیان کرنے کے لئے اس رکوع سے بنو اسرائیل کو مخاطب کرلیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور اس امر کی سچی گواہی دو کہ خدا تعالیٰ کا الہام دنیا میں ہمیشہ نازل ہوتا رہا ہے اور تم بھی اس کے مہبط رہے ہو۔ بلکہ یہ بھی کہ تمہاری کتب میں یہ بھی موجود ہے کہ ایک دن وحی الٰہی کا سلسلہ تم سے ہٹ کر تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

لفظ بنو اسرائیل کی وضاحت۔

اسرائیل

پیشتر اس کے کہ میں اس اجمال کی تفصیل بیان کروں۔ میں بنو اسرائیل کے لفظ کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے اسحاق علیہ السلام تھے۔ ان کے بیٹے کا نام یعقوب (علیہ السلام) تھا۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد تھے۔ حضرت یعقوبؑ یہود میں خاص حیثیت رکھتے ہیں اور انکی قوم کا نسلی امتیاز انہی کے نام سے قائم ہے۔ اسرائیل کا نام خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں ملا تھا جس کی وجہ سے ان کی اولاد بنی اسرائیل یعنی اسرائیل کی اولاد کہلائی۔ بائبل میں لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام سے ایک سفر کے دوران میں رات کے وقت ایک شخص نے کشتی لڑنی شروع کی اور ساری رات کشتی لڑتا رہا۔ بائبل کے بیان کے مطابق وہ کشتی لڑنے والا خدا تعالیٰ تھا (پیدائش باب ۳۲ آیت ۳۰) صبح کے وقت اس کشتی لڑنے والے نے حضرت یعقوبؑ سے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے یعقوب نام بتایا اس پر اس نے کہا کہ "تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کہ تو نے خدا اور خلق پاس قوت پائی اور غالب ہوا۔" (پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۸) بائبل کے شارحین کشتی لڑنے والے کو فرشتہ کہتے ہیں گو اس کا کوئی ثبوت نہیں دیتے بہرحال وہ فرشتہ ہو یا خدا تعالیٰ کو عالم تمثیل میں انہوں نے دیکھا ہو۔ اس نے حضرت یعقوبؑ کو اسرائیل کا نام دیا۔ اور اس کے معنے بھی بتا دیئے کہ خدا تعالیٰ اور مخلوق کے نزدیک وہ قوی سمجھا گیا اور غالب ہوا پس اسرائیل کے معنے بائبل کے بیان کے مطابق خدا کا قوی بندہ یا خدا کا غالب بندہ ہیں لغت کے معنے حل لغات میں بتائے جاچکے ہیں کہ خدا کے جنگجو بہادر یا قوی سپاہی کے ہیں یا فرمانبردار کے ہیں بہرحال حضرت یعقوبؑ کو رؤیا یا کشف میں اسرائیل کا نام دیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے ان کی اولاد بنو اسرائیل کہلائی۔

بنو اسرائیل اور یہودی

گو اس آیت میں یہودی کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں یہودی یا اس کی جمع ھُود کا لفظ استعمال ہوا ہے اور مناسب ہے کہ ان دونوں لفظوں کا فرق بھی بتا دیا جائے تا معلوم ہوسکے کہ بنو اسرائیل کا لفظ کس موقعہ پر استعمال ہوتا ہے اور یہودی

کا لفظ کس موقعہ پر استعمال ہوتا ہے۔

بنو اسرائیل کا لفظ قرآن کریم میں اڑتیس جگہ استعمال ہوا ہے اور یہودی کا لفظ نو جگہ اور ھود یہود کی جمع کے معنوں میں تین دفعہ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی یا ھُوْد جہاں بھی استعمال ہوا ہے مذہب کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے اور بنو اسرائیل کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے قوم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے یعنی جہاں حضرت یعقوب کی نسل کی طرف اشارہ مقصود ہے وہاں تو بنی اسرائیل کا لفظ استعمال کیا ہے اور جہاں ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو اپنے آپ کو موسیٰ کے پیرو کہتے تھے وہاں یہودی یا ھُوْد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ ھُوْد کا لفظ جن تین جگہ پر استعمال ہوا ہے اس کے ساتھ نصاریٰ کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ گویا یہودی مذہب اور نصرانی مذہب کے متبعین کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح یہود کا لفظ جن نو مقامات میں استعمال کیا گیا ہے ان میں سے بھی آٹھ مقامات میں نصاریٰ کے مقابل پر استعمال کیا گیا ہے جس سے واضح ہے کہ وہاں اسرائیلی قوم مُراد نہیں بلکہ موسوی مذہب مراد ہے۔ باقی ایک مقام میں نصاریٰ کا لفظ ساتھ استعمال نہیں۔ یعنی مائدہ رکوع $\frac{9}{13}$ میں۔ اس کی بھی سب آیتیں واضح طور پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ اس جگہ یہودی مذہب کے پیروؤں کا ذکر ہے نہ کہ کسی نسل کے لوگوں کا کیونکہ اس میں عقائد پر بحث ہے۔ اس کے بالمقابل بنی اسرائیل کا لفظ جہاں بھی قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے موسوی قوم پر دلالت کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور قرآن کریم کے کسی ایک مقام پر بھی اسے نصاریٰ کے مقابل پر استعمال نہیں کیا گیا۔

اس امتیاز کی وجہ سے جہاں تو بنی اسرائیل کا لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایسے لوگ بھی مخاطب ہو سکتے ہیں جو یہودی مذہب تو چھوڑ چکے ہوں لیکن ہوں حضرت یعقوبؑ کی نسل سے۔ مثلاً ان میں سے عیسائی یا مسلمان ہو جانے والے لوگ اسی طرح جہاں یہود یا ھود کا لفظ استعمال ہوا ہے اس میں ایسے لوگ بھی شامل سمجھے جا سکتے ہیں جو بنی اسرائیل سے تو نہ ہوں لیکن موسوی مذہب کو مانتے ہوں۔

یہود کا لفظ بنو اسرائیل اور یہودی کے استعمال میں فرق۔

شائد کسی کو یہ شبہ گزرے کہ یہودی لوگ تو اپنے مذہب میں کسی کو داخل نہیں کرتے اس لئے جہاں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے بعض نصرانی یا مسلمان ہو گئے ہوں وہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ کوئی غیر اسرائیلی یہودی مذہب میں داخل ہو گیا ہو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک بنی اسرائیل موسوی مذہب کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے تھے مگر اس میں بعض مستثنیات بھی تھے اور بعض قسم کے لوگوں کو یہودی مذہب میں شامل کرنے کی اجازت بھی ہوتی تھی مثال کے طور پر یہودیوں کے غلام یا ان کے ملک میں آ کر اور ان کے تابع ہو کر بسنے والے لوگوں کو یہودی مذہب قبول کرنے کی اجازت ہوتی تھی چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب خروج میں لکھا ہے کہ "اور اگر کوئی بیگانہ تمہارے ساتھ مقیم ہو۔ اور خداوند کی فسح کیا چاہے (یعنی یہود کی تہواروں میں شامل ہونا چاہے) تو اس کے سب مرد اپنا ختنہ کروائیں۔ تب وہ نزدیک آئے اور فسح کرے۔ اور اب وہ گویا تمہاری زمین میں پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ نامختون انسان اسے نہ کھائے گا۔ وطنی اور بیگانے کی جو تمہارے بیچ میں ہے ایک شریعت ہوگی" (خروج باب ۱۲ آیت $\frac{43}{49}$) ان آیات سے ظاہر ہے کہ موسوی شریعت گو اپنے آپ کو بنی اسرائیل سے مخصوص قرار دیتی ہے لیکن سوسائٹی میں ایک جتھا قائم رکھنے کے لئے اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ جو لوگ بنی اسرائیل کے درمیان آ کر بس جائیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک حکومت کا جزو بننا چاہیں وہ موسوی شریعت میں داخل ہو سکتے ہیں۔

لفظ بنی اسرائیل کا اطلاق ان لوگوں پر جو حضرت یعقوبؑ کی اولاد سے ہوں۔ خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی یا مسلمان۔

اسی طرح استثناء باب ۲۳۔ آیت ۳ تا ۸ میں ان قوموں کی لسٹ بتائی ہے۔ جن کے افراد بعض قیود کے ماتحت یہودی نظام میں شامل ہو سکتے ہیں۔

یسعیاہ میں لکھا ہے "اور بیگانے کی اولاد بھی جنہوں نے اپنے آپ کو خداوند سے پیوستہ کیا ہے کہ اسکی بندگی کریں

اور خداوند کے نام کو عزیز رکھیں۔ اور اس کے بندے ہو ویں وے سب جو سبت کو حفظ کر کے اسے ناپاک نہ کریں۔ اور میرے عہد کو لئے رہیں۔ میں ان کو بھی اپنے مقدس پہاڑ پر لاؤں گا۔ اور اپنی عبادت گاہ میں انہیں شادمان کرونگا اور ان کی سوختنی قربانیاں اور ان کے ذبائح میرے مذبح پر مقبول ہونگے کیونکہ میرا گھر ساری قوموں کی عبادت گاہ کہلائے گا" (باب ۵۶ آیت ۶-۷) عہد کو قائم رکھیں سے اس جگہ مُراد ختنہ کرانا ہے کیونکہ عہد ابراہیمی کی علامت ختنہ کو قرار دیا گیا تھا اس کی تائید استثناء باب ۱۲ کے مذکورہ بالا حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔

مشہور یہودی عالم جوزیفس لکھتا ہے کہ مذہب بدل کر یہودی بننے والا شخص وہ ہے جو یہودی رسموں کو اختیار کرے اور جو یہودی قانون کی اتباع کرتے ہوئے اور خدا تعالیٰ کی اس رنگ میں عبادت کرتے ہوئے کہ جس رنگ میں کہ یہود عبادت کرتے ہیں (یہودی ہو جائے) (جُوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱ صفحہ ۲۲۰)

غیر بنی اسرائیل کے علاوہ اور لوگوں کو موسوی مذہب میں داخل ہونے کی اجازت

بائبل سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ عملاً بھی بعض لوگ موسوی مذہب کو قبول کر لیتے تھے چنانچہ بائبل کی ایک کتاب روت نامی ہے یہ روت جس کا اس میں ذکر ہے۔ موآبی لڑکی تھی جو ایک اسرائیلی سے بیاہی گئی اور اس نے موسوی مذہب کو قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح عزرا باب ۳ آیت ۲ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسوری لوگ جو فلسطین میں بس گئے تھے انہوں نے بھی یہودی طریقہ کو اختیار کر لیا تھا تاریخ سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے چنانچہ رومی مؤرخین ٹیسیٹس (Tacitus) ڈایوکیسیس (Diocassious) اور ہوریس (Horece) وغیرہم نے اپنی کتب میں ان رومیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے یہودی مذہب کو قبول کر لیا تھا (جُوئش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ ۲۲۰) اسلامی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کے عربوں میں سے بھی بعض لوگوں نے یہودی مذہب کو اختیار کیا ہوا تھا چنانچہ کعب بن اشرف مشہور

موسوی مذہب کے بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہونے کے معنے

دشمن اسلام جس نے معاہدین میں شامل ہونے کے باوجود دشمنانِ اسلام کو مدینہ پر چڑھائی کے لئے اکسایا تھا اور مسلمانوں کے قتل کے منصوبے کئے تھے اور اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا فتویٰ دیا تھا۔ ایسے ہی لوگوں میں سے تھا۔ اس کا باپ بنو نبہان قبیلہ کا عرب تھا ایک شخص اس کے ہاتھ سے قتل ہو گیا اور وہ بھاگ کر مدینہ آ گیا وہاں اس نے یہودی قبیلہ بنو نضیر سے معاہدہ کر لیا اور اسی قبیلہ کی ایک لڑکی عقیلہ بنت ابی الحقیق سے شادی کر لی اور اس طرح یہودیوں میں شامل ہو گیا آگے اس کا بیٹا کعب بھی یہودی المذہب رہا (زرقانی جلد ۲ صفحہ ۸ زیر عنوان قتل کعب ابن الاشرف)

اسی طرح بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشرکین مدینہ نذر کے طور پر اپنی اولاد کو یہود میں داخل کرنے کا اقرار کر لیتے تھے اور وہ بڑے ہو کر یہودی مذہب کے ہو جاتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے "کَانَتِ الْمَرْأَۃُ تَکُوْنُ مِقْلَاۃً فَتَجْعَلُ عَلٰی نَفْسِهَا اِنْ عَاشَ لَهَا وَلَدٌ اَنْ تُهَوِّدَهٗ فَلَمَّا اُجْلِیَتْ بَنُو النَّضِیْرِ کَانَ فِیْهِمْ مِنْ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ فَقَالُوْا لَا نَدَعُ اَبْنَاءَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ. کہ مدینہ کی عورتوں میں سے جب کسی عورت کے بچے بچپن میں ہی فوت ہو جاتے تو وہ نذر مان لیتی کہ اگر اس کا بچہ بچ جائے تو وہ اس کو یہودی مذہب میں داخل کر دیگی۔ چنانچہ جب بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا۔ تو ان میں انصار مدینہ کے ایسے بچے تھے جن کو یہودی بنایا گیا تھا۔ تو انصار نے ان کو ان کے ساتھ بھیجنے سے انکار کیا۔ اس وقت یہ آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ نازل ہوئی کہ مذہب کے بارے میں کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا (ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام)

خلاصہ یہ کہ موسوی مذہب کے بنی اسرائیل کیلئے مخصوص ہونے کے یہ معنے نہیں کہ کوئی غیر اسرائیلی کبھی یہودی ہو ہی نہ سکتا تھا بلکہ خود حضرت موسیٰ کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق غلام یا تابع رہنے والے لوگ اگر موسوی دین پر عمل کریں اور ختنہ

کرلیں تو وہ موسوی مذہب میں داخل ہو سکتے تھے موسوی مذہب کے اسرائیلیوں تک مخصوص ہونے کے صرف یہ معنے ہیں کہ یہ مذہب تبلیغی نہیں اور انہیں حکم نہیں کہ دوسری قوموں میں جاکر تبلیغ کریں اور اس میں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے خاص ترقیات کے وعدے ہیں وہ اسرائیلیوں کے لئے ہیں دوسری اقوام کو طفیلی اور تابع کے طور پر اگر کامل طور پر ان سے مل جائیں حصّہ دیا جا سکتا ہے برخلاف اسلام کے کہ اس کے پیروؤں کو تبلیغ کرنے اور استثنائی طور پر نہیں بلکہ قاعدہ کلیہ کے طور پر ساری دُنیا میں اسلام پھیلانے کا حکم ہے اور اس میں داخل ہونے والوں سے کوئی وعدہ نہیں جو صرف عربوں سے مخصوص ہو بلکہ ہر وعدہ اپنی انتہائی صورت میں اسی طرح غیر عربوں کے لئے ہے جس طرح کہ عربوں کے لئے۔

خلاصہ یہ کہ چونکہ موسوی دین کے تابع لوگوں کو استثنائی صورتوں میں غیر اسرائیلیوں کو بھی اپنے دین میں شامل کرنے کی اجازت تھی اور محدود تعداد غیر قوموں کی ان میں شامل بھی ہوتی رہتی تھی اس لئے ضروری تھا کہ بنی اسرائیل کے سوا ان کا کوئی اور نام بھی ہوتا جس کے ذریعہ سے اس کے افراد کی قوم کی طرف نہیں بلکہ مذہب کی طرف نسبت ثابت کی جاتی۔ اس غرض کو پُورا کرنے کے لئے آہستہ آہستہ یہودی کے لفظ کو اختیار کیا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب زمانہ میں چونکہ ایسے لوگ بہت کم تھے جو باوجود غیر اسرائیلی ہونے کے یہودی مذہب قبول کریں انہیں اپنے اندر رہنے والے غیر یا بیگانہ کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا مگر جب حضرت داؤد علیہ السلام کے ذریعہ سے بنی اسرائیل میں حکومت آگئی اور ان کی حکومت کا حلقہ وسیع ہو گیا اور غیر قومیں اسرائیلیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور اسرائیلی حکومت تلے بسنے والوں میں سے ایک خاصے طبقے نے موسوی مذہب اختیار کر لیا تب یہ ضرورت بشدت محسوس ہوئی کہ اسرائیل کے سوا کوئی اور نام بھی ہو جو ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہو۔

اس نام کا انتخاب بعض سیاسی حالات نے خود ہی کر دیا اور وہ اس طرح کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا لڑکا ایک دُنیا دار آدمی تھا اس کی تخت نشینی پر بنی اسرائیل کے سردار اس کے پاس ملنے آئے اور اس سے قانون میں بعض نرمیاں کرنے کی درخواست کی اس پر اس نے اپنے نوجوان دوستوں کے مشورہ سے انہیں سخت جواب دیا اور دھتکار کر دربار سے رخصت کر دیا اس پر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے دس کے سرداروں نے دربار سے باہر نکلتے ہی بغاوت کا فیصلہ کر لیا اور رحبعام بن سلیمان سے باغی ہو گئے اور رحبعام کے ماتحت صرف یہود کا علاقہ (جسے اب فلسطین کہتے ہیں) اور یہودا اور بن یامین دو قبیلوں کے آدمی رہ گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت داؤد یہودا کے قبیلہ میں سے تھے اور بن یامین کے قبیلہ میں وہ پیدا ہوئے تھے اور انہیں کی مدد سے انہوں نے پہلے یہودا قبیلہ کے علاقہ کو اور پھر باقی اسرائیل کے علاقہ کو فتح کیا تھا (زیر لفظ داؤد جُوئش انسائیکلوپیڈیا) پس ان دونوں قبیلوں میں آپس میں بہت جوڑ تھا اور اس بغاوت کے وقت بھی وہ اکٹھے رہے۔

۲۵۱ بنی اسرائیل کے علاوہ لفظ یہود کو اختیار کرنے کی وجہ۔

اس بغاوت کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسرائیلیوں کی دو حکومتیں ہو گئیں ایک اس وجہ سے کہ حضرت داؤد یہودا قبیلہ میں سے تھے (۱۔تواریخ باب ۳ و ۹ تا ۱۵ نیز متی باب ۱ آیت ۲ ولوقا باب ۳ آیت ۳۳) اور یہودا کے علاقہ میں بستے تھے یہودیہ کہلائی اس میں یہودا اور بن یامین قبائل کے افراد شامل تھے (۲۔تواریخ باب ۱۱ آیت ۱) اور دوسری اس وجہ سے کہ اسرائیل کے اکثر قبائل اس میں شامل تھے اسرائیل کی حکومت کہلائی یہودیہ حکومت کا زور فلسطین میں تھا تو اسرائیل کی حکومت کا شمالی فلسطین اور مغربی شام کی طرف۔ اس اختلاف کے بعد اسرائیل کی حکومت متواتر بُت پرستی کی طرف راغب ہوتی گئی اور تورات کے علماء اسے چھوڑ کر یہودیہ کی طرف بھاگ آئے اور موسوی مذہب کا گڑھ یہودیہ کی حکومت بن گئی جو آہستہ آہستہ موسوی مذہب کی واحد علمبردار ہو گئی چنانچہ پہلے

تو اسرائیل کے حکومت کے باشندوں اور یہودیہ کی حکومت کے باشندوں میں فرق کرنے کے لئے یہودیہ کے باشندوں کو یہودی کہا جانے لگا لیکن جوں جوں مذہبی اختلاف کی خلیج بڑھتی گئی یہودی کا لفظ مقام رہائش کو بتانے کی بجائے مذہب کو بتانے کے لئے استعمال ہونے لگا اور عزیر اور نحمیاہ دو نبیوں کے ذریعہ سے جب یہود یہ دوبارہ بسایا گیا اور مذہب موسوی کی باگ ڈور کلی طور پر یہود کے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی تو یہودی کا لفظ نسلی امتیاز یا مقام رہائش کے معنوں سے بالکل الگ ہو کر مذہب (موسوی کے پیرو) کے معنوں میں استعمال ہونے لگا کیونکہ اس زمانہ سے موسوی مذہب کا احیاء صرف یہود اکے لوگوں کے ذریعہ سے ہی ہوتا تھا اور جب یہ لفظ خالص مذہبی معنوں میں استعمال ہونے لگا تو اس کا اطلاق ان غیر اسرائیلی لوگوں پر بھی کیا جانے لگا جو نسلاً تو اسرائیلی نہ تھے لیکن مذہباً موسوی مذہب کے پیرو تھے۔ پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں جبکہ اسرائیلیوں کا ایک حصہ حضرت مسیح پر ایمان لے آیا تو اسرائیلیوں کی بھی دو اقسام ہوگئیں ایک جو یہودی مذہب پر تھے اور دوسرے جو مسیحی تھے اسلام نے آکر اسرائیلیوں میں سے بعض کو مسلمان بنا لیا اور اس طرح ایسے اسرائیلی بھی ہو گئے جن کا مذہب اسلام تھا۔

قرآن کریم پر اسرائیلی تاریخ سے ناواقفیت کا الزام لگانے والوں کا جواب۔

خلاصہ یہ کہ یہودیہ کے رہنے والوں میں چونکہ موسوی مذہب نے فروغ پایا اور تمام بڑے انبیاء وہیں پیدا ہوئے یا اسی سے تعلق رکھتے تھے جیسے یرمیاہ حزقیل دانیئل عزرا نحمیاہ وغیرہم۔ اور اسرائیلی حکومت میں بت پرستی رائج ہوا گئی۔ یہودیہ کی حکومت کے توابع یہود کے نام سے مشہور ہوئے اور چونکہ اس زمانہ میں بہت سے غیر اسرائیلی بھی موسوی مذہب میں داخل ہوئے۔ مذہب موسوی رکھنے والوں کا نام قوم سے ممتاز کرنے کے لئے یہودی ہو گیا۔ اور اسلام سے چند صدی پہلے یہودی کے معنے موسوی مذہب رکھنے والے کے ہو گئے۔ مگر چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وعدے جو دنیاوی عزت اور اعلیٰ روحانی

لفظ یہود کے استعمال کی ابتداء اور اس کے معنے کی وسعت۔

مراتب سے متعلق تھے ان کی نسلوں سے خاص تھے بنی اسرائیل کا لفظ الگ طور پر قومی امتیاز کو بتانے کے لئے قائم رہا۔

میں نے کسی قدر تفصیل سے یہ امر اس لئے بیان کیا ہے تا یہ بتاؤں کہ قرآن کریم جس پر یہودی مذہب اور اسرائیلی تاریخ سے ناواقفیت کا الزام لگایا جاتا ہے اس امتیاز کو صحیح طور پر بیان کرتا ہے یعنی جہاں مذہب کا سوال ہوتا ہے یہودی کا لفظ استعمال کرتا ہے لیکن جہاں ان قومی وعدوں کا ذکر کرتا ہے جو آل ابراہیم یا آل موسیٰؑ یا آل داؤد سے خاص تھے یا موسوی انبیاء کے مخاطبین کا ذکر کرتا ہے وہاں یہودی کا لفظ استعمال نہیں فرماتا بلکہ بنی اسرائیل کا لفظ استعمال فرماتا ہے کیونکہ وہ وعدے موسوی دین اختیار کرنے والوں سے نہ تھے بلکہ ان بنی اسرائیل سے تھے جو خدا تعالیٰ کے عہد کو قائم رکھیں خواہ موسوی دین پر ہوں خواہ اس کے بعد آنے والے کسی اور الٰہی دین پر ہوں جیسے کہ مسلمان ہونیوالے بنی اسرائیل مگر لطیفہ یہ ہے کہ اس کے برخلاف ان معترضین کا جو قرآن کریم پر اسرائیلی تاریخ سے ناواقفیت کا الزام لگاتے ہیں یہ حال ہے کہ ان کی مذہبی کتب تک اس بارہ میں غلطی کر جاتی ہیں چنانچہ اناجیل نے بھی اس بارہ میں غلطی کی ہے مثلاً مسیح علیہ السلام کی نسبت لکھا ہے "یہودیوں کا بادشاہ" چنانچہ لکھا ہے کہ پیلاطوس نے مسیح علیہ السلام سے پوچھا "کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے یسوع نے اس سے کہا ہاں تو سچ کہتا ہے" (متی باب ۲۷ آیت ۱۱ قرس باب ۱۵ ۲ ولوقا باب ۲۳ ۳) اس بادشاہت کے دعویٰ کی بنیاد ذکریاہ نبی کی کتاب پر ہے اس میں لکھا ہے "اے صیحون کی بیٹی تو نہایت خوشی کر اے یروشلم کی بیٹی تو خوب للکار کر دیکھ تیرا بادشاہ تجھ پاس آتا ہے" (ذکریاہ باب ۹ آیت ۹) اس عبارت سے ظاہر ہے کہ ذکریاہ نے ایک اسرائیلی بادشاہ کی خبر دی ہے جو یروشلم کو پھر اس کی سابق شوکت پر لائے گا پس اس سے مراد اسرائیلیوں کا بادشاہ ہے نہ یہود کا بادشاہ چنانچہ یوحنا باب ۱۲ آیت ۱۳ میں لکھا ہے "تو اسرائیل کا بادشاہ ہے" اور یہی درست ہے کیونکہ موسوی سلسلہ کے ترقی کے وعدے

بنی اسرائیل سے مخصوص تھے نہ کہ ہر یہودی مذہب کو قبول کرنے والے سے۔ اسی طرح حضرت مسیح کا خطاب صرف بنی اسرائیل سے تھا چنانچہ لکھا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب اپنے مریدوں کو تبلیغ کے لئے بھجوایا تو کہا کہ ’’غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا‘‘ (متی باب ۱۰ آیت ۵) یاد رہے کہ سامری مخلوط نسل کے آدمی تھے اور اکثر ان میں سے یہودی باپوں کی نسل میں سے تھے اور تورات کو مانتے تھے اور اسی پر ان کا عمل تھا۔ جب سامریوں تک سے علیحدہ رہنے کا حکم مسیح نے دیا تو جو بالکل غیر قومیں ہیں ان کا کیا ذکر ہے۔

یہ غلطی مسیحیوں کو ایسی چمٹی ہے کہ آج تک وہ اس غلطی میں مبتلا ہیں چنانچہ آج جرمنی اور بعض دوسرے یورپین ممالک میں اسرائیلی نسل کے خلاف جو جوش پیدا ہے اس میں یہی کہا جاتا ہے کہ ’’یہودیوں‘‘ کو ملک سے نکال دو اور اس سے انکی مراد یہ نہیں ہوتی کہ جو موسوی مذہب کے تابع ہیں ان کو ملک سے نکال دو بلکہ یہ مخالفت ان لوگوں کے خلاف بھی ہے جو نصرانی مذہب اختیار کر چکے ہیں حالانکہ وہ بنی اسرائیل تو بیشک ہیں مگر یہودی کسی صورت میں بھی نہیں کیونکہ اپنا مذہب تبدیل کر چکے ہیں جرمنی میں تو یہ جوش اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ جن لوگوں کی رگوں میں کسی اسرائیلی عورت کا خون بھی ہے اسے بھی ملک کا دشمن قرار دیا جاتا ہے لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ یہ یہودی ہیں یا یہودی خون ان کے اندر ہے حالانکہ نہ وہ یہودی مذہب کے پابند ہیں اور نہ ان ماؤں کا مذہب یہودی تھا جنکی وہ اولاد ہیں بلکہ ان کی مائیں بھی مسیحی تھیں اور ان کی نسل بھی مسیحی ہے۔

غرض اس علمی زمانہ میں بھی کہ جسکی علمی ترقی پر یورپ کو اس قدر ناز ہے اسرائیلی اور یہودی کے فرق کو بالکل نہیں سمجھا جاتا لیکن قرآن کریم نے تیرہ سو سال پہلے اس فرق کو تسلیم کیا ہے اور جہاں جہاں نسلی ترقی کے وعدوں کا ذکر ہے یا نبیوں کے خطاب کا ذکر ہے وہاں بنی اسرائیل کا لفظ استعمال کیا ہے اور جہاں صرف مذہب کا ذکر ہے وہاں یہودی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ آیات زیر تفسیر میں چونکہ ان وعدوں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے یا ان وعدوں کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ابراہیمی نسل سے تھے اس لئے ان آیات میں اور ان کے بعد کی آیات میں ہر جگہ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کہا گیا ہے ایک جگہ بھی یہودی کا لفظ استعمال نہیں فرمایا۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ زائد کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف اپنی نعمت نہیں جتائی بلکہ اس سے زائد مضمون کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق جب حروف یا الفاظ میں زیادتی کی جائے تو وہ جدید یا زائد مضمون پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے پس اس آیت میں اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کے الفاظ سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ وہ نعمت ہے جو تمہاری قوم کے لئے خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی نعمتیں۔

اللہ تعالیٰ کی دو قسم کی نعمتیں ہوتی ہیں ایک وہ جو عام ہیں مومن و کافر کو مل رہی ہیں جیسے ہوا پانی آگ خوراک وغیرہ لیکن ایک ایسی نعمتیں وہ ہیں جو خاص شرائط پورا کرنے والے مقربوں کو ملتی ہیں یا خاص وعدوں کے مطابق نازل ہوتی ہیں اگر تو عام نعمتوں کا ذکر ہوتا جو خاص وعدہ کے مطابق نہیں ملتیں بلکہ ہر کافر و مومن پر نازل ہوتی ہیں تو خالی اُذْكُرُوْا نِعَمِيْ کہنا کافی تھا لیکن اس جگہ اوّل تو نِعْمَتِيَ کا لفظ مفرد رکھا گیا ہے جس سے خاص نعمت مراد ہے اور پھر اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ کے الفاظ بڑھائے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ نعمت تم پر خاص تھی دوسرے لوگ دنیا کے اس میں شامل نہ تھے۔

بنی اسرائیل کو ملنے والی نعمت کیا تھی؟

یہ نعمت کیا ہے؟ اسے ہم قرآن کریم سے ہی دیکھتے ہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ

اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ (مائدہ ع۴) یعنے یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ اس نے تم میں بہت سے انبیاء مبعوث فرمائے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ کچھ دیا جو اور کسی کو جہانوں میں سے نہ دیا تھا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو انہوں نے اس وقت بنی اسرائیل سے کہا تھا جب وہ ارضِ مقدسہ کے قریب پہنچ گئی تھی اور اس میں داخل ہونے کا اسے حکم دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کی قوم بادشاہ نہ بنی تھی بلکہ ابھی تک جنگلوں میں سرگردان پھر رہی تھی اس سے پہلے بھی کسی زمانہ میں وہ بادشاہ نہ بنی تھی کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت یوسفؑ تک ان میں سے کوئی بادشاہ نہ ہوا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد تو وہ مصر میں غلام ہو کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسے اس غلامی سے نکالا گیا لیکن بادشاہت اب تک اسے نصیب نہ ہوئی تھی صرف اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ارضِ مقدسہ میں اسے بادشاہت دی جائے گی اور جیسا کہ اگلی آیت میں بتایا گیا ہے اس قول تک وہ ارضِ مقدسہ میں داخل نہ ہوئی تھی پس جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا سے یہ مراد نہیں کہ تم کو گزشتہ زمانہ میں بادشاہ بنایا گیا تھا بلکہ صرف یہ مراد ہے کہ تم کو بادشاہ بنانے کا خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے اور چونکہ ساری آیت میں مضمون کا ایک ہی سلسلہ پیش کیا گیا ہے اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ بھی خدا تعالیٰ کے آئندہ وعدے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس میں سابق انبیاء کا ذکر نہیں۔ اور مطلب اس قول کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کو یاد کرو جو اس نے تم سے کیا ہے کہ وہ تم میں سے کثرت سے نبی بنائے گا اور تم کو بادشاہ بنائے گا اور تم کو وہ کچھ دے گا جو اور کسی قوم کو نہیں دیا گیا گویا سابق شوکت کا ذکر نہیں بلکہ آئندہ ملنے والی شوکت کا ذکر ہے اور ماضی کے الفاظ حتمی وعدہ کے لحاظ سے استعمال کئے گئے ہیں نہ اس لئے کہ ایسا گزشتہ زمانہ میں ہو چکا ہے اس وعدہ کو یاد دلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو ارضِ مقدسہ میں داخل ہونے کا حکم دیا اور بتایا کہ وہ وعدہ ارضِ مقدسہ میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے پس تم ارضِ مقدسہ کو فتح کرنے میں دیر نہ کرو تاکہ اس وعدہ کا ظہور شروع ہو جائے۔

بنی اسرائیل پر اتمام نعمت کرنے سے مراد ان کو بادشاہ بنانا اور ان میں انبیاء کا مبعوث کرنا تھا۔

آئندہ زمانہ کے واقعات نے اس وعدہ کے پورا ہونے کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا اور بنی اسرائیل میں کثرت سے نبی آئے اور ان کو بادشاہ بنا دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ایک لمبے سلسلہ کے ذریعہ سے ان پر پے در پے روحانی علوم کھولے جس کی مثال اور کسی گزشتہ قوم میں نہیں ملتی۔

بنی اسرائیل پر اتمام نعمت کا وعدہ حضرت ابراہیم کے زمانہ سے شروع ہوا۔

یہ وعدہ کب ہوا: بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وعدہ کی ابتدا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوئی بائبل میں لکھا ہے "تب اس نے اسے (ابراہیم کو) کہا کہ میں خداوند ہوں جو تجھے کسدیوں کے اُور سے نکال لایا کہ تجھ کو یہ ملک میراث میں دُوں" (پیدائش باب۱۵ آیت۷) اس کے آگے اسی باب میں بتایا ہے کہ یہ وعدہ اس طرح پورا ہوگا کہ پہلے ان کی قوم ایک اور ملک میں جا کر غلام بنے گی اور چار پشت بعد ان کو وہاں سے نکالا جائے گا وہاں سے نکالا جانے کے بعد وہ فلسطین کی بادشاہ بنے گی یہ وقفہ اس لئے پڑے گا کہ اموری جو فلسطین میں بستے ہیں ابھی تک ان کے گناہ اس حد کو نہیں پہنچے کہ ان کو سزا دیکر اس ملک سے نکالا جائے۔ اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ پہلے وعدہ ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا اور اس کے پورا ہونے کا وقت وہ بتایا گیا تھا جب بنی اسرائیل مصر میں غلام بن کر رہنے کے بعد وہاں سے نکلیں گے اور یہ زمانہ جیسا کہ بائبل تاریخ اور قرآن کریم سے ثابت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ پس ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جو قول بتایا گیا ہے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وعدہ کی طرف اشارہ ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس وعدہ میں بادشاہت کا تو ذکر ہے مگر نبوت کا ذکر نہیں مگر بائبل کے دوسرے مقامات کو ملا کر اس حصہ کا بھی پتہ لگ جاتا ہے۔ چنانچہ سترھویں باب میں لکھا ہے "اور میں

اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ مَیں تجھے نہایت بڑھاؤں گا تب ابراہیم مُنہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہو کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا (جس کا عربی تلفظ ابراہیم ہے) کیونکہ مَیں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا اور میں تجھے بہت برومند کرتا ہوں **اور قومیں تجھ سے پیدا ہونگی اور بادشاہ تجھ سے نکلینگے** اور مَیں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہو کرتا ہوں **کہ مَیں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہونگا**۔ اور مَیں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ **کے لئے مِلک ہو** اور مَیں **ان کا خدا ہونگا۔**"

(باب ۱۷ آیت ۲ تا ۸) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے دو وعدے کئے تھے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کی قوم کو کنعان میں داخل کرے گا اور اس کے بعد (۱) انہیں وہاں کا بادشاہ کرے گا (۲) دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کا خدا ہوگا۔ خدا ہونے کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہاں روحانی ترقیات کا وعدہ ہے کیونکہ بادشاہت میں دنیاوی ترقیات کا وعدہ آچکا تھا۔

اوپر کے حوالہ سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بائبل کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی اولاد آیندہ زمانہ میں کنعان میں آئے گی اور ان کو بادشاہت اور اعلیٰ روحانی ترقیات عطا ہونگی۔ یہ وعدہ بعد میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے بھی دُہرایا گیا ہے لیکن ابتداءً اس کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے ہی کیا گیا تھا پس سورۂ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت میں جس نبوت اور بادشاہت کے دیئے جانے کا ذکر ہے وہی موعود بادشاہت اور نبوّت ہے اور آیت زیر تفسیر میں نعمت سے مُراد وہی نعمت مراد ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے اور جس کا ثبوت بائبل سے میں پیش کر چکا ہوں اس نعمت کو یاد دلا کر یہ اشارہ کیا ہے کہ انعام نبوّة آدم پر ختم نہیں ہو چکا بلکہ بنی اسرائیل میں ایک نہیں دو نہیں بلکہ ایک لمبا سلسلہ نبوّت کا جاری رہا ہے۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل پر اتمام نعمت کے مذکور وعدہ کا ذکر بائبل میں

قرآن کریم میں بھی اسی سورۃ میں اس موعود نعمت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں کیا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ (بقرہ ع ۱۵) یعنی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی بعض کلمات کے ذریعہ سے آزمائش کی تو ابراہیم نے ان احکام الٰہی کو پورا کر دیا اسپر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں تجھے لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں تب ابراہیمؑ نے عرض کیا کہ میری اولاد میں سے بھی بعض کو امام بنایا جائے اسپر اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ظالموں کو میرا عہد نہیں پہنچے گا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امام بنانے یعنی اولوالامر نبی کے درجہ پر فائز کرنے کا وعدہ فرمایا (۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی نسبت بھی اس وعدہ کی توسیع کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے مشروط وعدہ فرمایا یعنے وعدہ کیا کہ تمہاری اولاد میں سے بعض اس عہد سے حصہ پائیںگے مگر حصہ پانے والے وہی ہونگے جو قومی ظلم کے ذریعہ سے اپنے آپ کو محروم نہ کر چکے ہوں۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ اس جملہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ گو آخری قوم جس میں الہام کا سلسلہ دیر تک جاری رہا بنی اسرائیل کی قوم تھی لیکن ان سے جو وعدہ کیا گیا تھا وہ مشروط تھا جب تک بنی اسرائیل اس وعدہ کے مستحق رہے اللہ تعالےٰ اپنے عہد کو پورا کرتا رہا مگر جب بنی اسرائیل کلی طور پر اس عہد کے انعامات کے ناقابل ہوگئے تو لازماً وہ عہد دوسری طرف

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْ میں اس طرف اشارہ کہ بنی اسرائیل کے ساتھ وعدہ مشروط تھا۔

منتقل ہو گیا۔ اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا ذکر آ چکا ہے وہ وعدہ یہ تھا کہ ان کی اولاد میں بھی نبی ہونگے مگر جب ان کی اولاد کا کوئی حصہ ظالم ہو جائے گا تو پھر وہ اس عہد کا مستحق نہیں رہے گا اور عہد اولاد کے دوسرے حصہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔

خدا تعالیٰ کے تمام نعمت کا وعدہ مشروط ہونے کا ذکر بائبل میں۔

بائبل میں بھی اس عہد کے مشروط ہونے کا ذکر ہے پیدائش باب ۱۷ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "پھر خدا نے ابراہام سے کہا کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر اک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۹ تا ۱۱) "اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا" (آیت ۱۴)

حضرت ابراہیم کے واسطہ سے انکی اولاد سے خدا تعالیٰ کے دو وعدے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اولاد کی نسبت جو عہد کیا گیا تھا وہ مشروط تھا اور اس کی ظاہری علامت ختنہ تھا اور صاف کہہ دیا گیا تھا کہ اولاد میں سے جو اس عہد کی پابندی نہ کریگے خدا تعالیٰ کا عہد بھی ان سے کوئی نہ رہے گا اور ان کو وہ انعامات نہ ملیں گے جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے وعدہ کیا گیا تھا۔

یاد رہے کہ اس وعدہ میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ یہ اس عہد کا 'نشان' ہے جو اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ بندہ کی طرف سے عہد ختنہ کا نہیں بلکہ عہد اور ہے ہاں اس کا ظاہری نشان ختنہ ہے یہود نے اس کو نہ سمجھا اور صرف ختنہ پر خوش ہو گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس طرف توجہ دلائی کہ وہ صرف کسی ایک حکم پر عمل کر کے خوش نہ ہوں اور یہ نہ سمجھیں کہ اس کے ذریعہ سے انہوں نے عہد کا اپنا حصہ پورا کر دیا ہے وہ اپنی قوم کو خدا تعالیٰ کا یہ حکم پہنچاتے ہیں "پر اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو اور میری سنتوں کو حقیر جانو یا تمہارے دل میری عدالتوں کو ناپسند کریں ایسا کہ تم میرے حکموں پر عمل نہ کرو اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ویسا ہی کرونگا اور خوف اور سل اور تپ سوزاں کو تمہارے اوپر غالب کرا ونگا جس سے تمہاری آنکھیں پھوٹیں اور دل دکھیں اور تم اپنے بیج بے فائدہ بوؤ گے اس لئے کہ تمہارے دشمن اسے کھائیں گے اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہوگا" (احبار باب ۲۶ آیت ۱۴ تا ۱۷) (آخری الفاظ کو عہد کے ان الفاظ کے ساتھ ملا کر دیکھنا چاہیئے کہ میں تیرا اور تیری نسل کا خدا ہونگا) اس حوالہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ختنہ صرف ایک ظاہری نشان تھا اور نہ اصل عہد جسکی پابندی کی حضرت ابراہیم کی اولاد سے توقع کی گئی تھی یہ تھا کہ وہ دل کے پاک ہوں خدا تعالیٰ کی سنتوں پر مٹھن ہوں اور اس کے سب احکام پر عمل کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے نبیوں نے بھی اس مضمون کو خوب کھول کر بیان کیا ہے یرمیاہ نبی بنی اسرائیل کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہوئے فرماتے ہیں "اسرائیل کے سارے گھرانے کے دل نامختون ہیں" (باب ۹ آیت ۲۶) اسی طرح فرماتے ہیں "دیکھ وے دن آتے ہیں خداوند کہتا ہے کہ میں ان سب کو جو مختون ہیں نامختون کے ساتھ سزا دوں گا" (باب ۹ آیت ۲۵) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یرمیاہ نبی جسم کے مختون ہونے کو عہد کا پورا کرنا نہیں سمجھتے بلکہ دل کے مختون ہونے کو اصل ذریعہ عہد کے پورا کرنے کا قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واسطہ سے ایک معاہدہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد سے کیا تھا۔ اس معاہدہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے خدا رسیدہ لوگ پیدا کرے گا جو قرآن کریم کے بیان کے مطابق امام یعنی اولوالعزم نبی ہونگے اور دوسرے یہ کہ وہ انہیں کنعان کا ملک بطور میراث دے گا جس کے وہ بادشاہ

ہونگے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وحی چونکہ اصل صورت میں محفوظ نہیں اس کا جس قدر حوالہ بائبل سے مل سکتا ہے بیشک اس میں ختنہ کی پوری تشریح نہیں مگر حضرت موسیٰ کی کتاب احبار اور یرمیاہ نبی کی وحی سے یہ ثابت کر دیا کہ ختنہ سے مراد صرف ظاہری ختنہ نہیں بلکہ اصل مراد دل کی صفائی اور کامل فرمانبرداری ہے جسمانی ختنہ اس کے لئے بطور علامت قرار دیا گیا ہے۔

اس تشریح کے مطابق آیت زیرِ تفسیر کے معنے یہ ہوئے کہ اے بنی اسرائیل یاد کرو کہ ہمارے تمہارے درمیان ایک عہد ہوا تھا اس عہد کا جو حصہ ہمارے متعلق تھا وہ ہم نے پورا کر دیا تم میں سے پے در پے نبی بھی بھجوائے اور بادشاہ بھی بنائے اور اس کے بالمقابل جو حصہ عہد کا تم سے تعلق رکھتا تھا وہ تم نے پورا نہ کیا اور تمہارے دل نامختون ہو گئے اور تم نے اپنے خدا کے حکموں کو بھلا دیا اور اسکے نتیجہ میں تمہارے دلوں میں غیر اللہ کا خوف جاگزیں ہو گیا اگر تم اپنے حصۂ عہد کو پورا کرد تو میں بھی پھر اپنے عہد کو تم سے پورا کرنے کو تیار ہوں لیکن تمہارا یہ امید کرنا کہ مَیں تو عہد کے اس حصہ کو پورا کرتا جاؤں جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے لیکن تم متواتر اس حصہ کو نظر انداز کرتے جاؤ جو تمہارے متعلق ہے درست نہیں۔

جیسا کہ مَیں اوپر لکھ آیا ہوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہی عہد دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے پھر دُہرایا گیا ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اسرائیلی قوم کی شریعت لانے والے تھے ان کے ذریعہ سے بھی یہ عہد دُہرایا گیا تھا۔ یہ عہد ایسا مشہور و معروف ہے کہ بائبل میں بیسیوں جگہ اس کا ذکر آتا ہے اور بار بار اسے عہد کے نام سے پکارا گیا ہے خروج باب ٢٠ میں وہ دس احکام جو حضرت موسیٰؑ کی معرفت دیئے گئے اور بنی اسرائیل کے ساتھ ایک نیا عہد باندھا گیا تفصیلاً درج ہیں۔ استثناء باب ۵۔ آیت ٢۔ اور باب ۱۸ آیت ۱۸ و ۱۹ کو ملا کر معلوم ہوتا ہے کہ سینا پہاڑ پر یا حورب پر جو نام کوہِ سینا کا کتاب استثناء میں مستعمل ہے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو بُلا کر دس حکم دیئے۔ اور بنی اسرائیل سے ایک نیا عہد باندھا (استثنا باب ۵۔ آیت ٢) اور کہا کہ اگر وہ ان احکام کے پابند رہیں تو میں انکی قوم کو زندہ رکھونگا اور ان کا بھلا ہوگا اور ارضِ مقدس پر ان کے قبضہ کی مہلت لمبی ہوتی چلی جائے گی (استثناء باب ۵ آیت ٣٣) جس وقت یہ احکام نازل ہو رہے تھے اور خدا تعالےٰ کا جلال کوہِ سینا یا حورب پر ظاہر ہو رہا تھا خطرناک بجلی چمک رہی تھی اور مہیب آوازیں آ رہی تھیں جسے دیکھ کر بنی اسرائیل جو خدا تعالیٰ سے عہد باندھنے کے لئے اپنے خیموں سے باہر نکل کر دامنِ کوہ میں کھڑے تھے ڈر گئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم اس کلام کو نہیں سُنتے تو خدا سے سُنکر ہمیں سُنا دیا کر ہم ڈرتے ہیں کہ ہم اس کلام کو سُنکر کہیں مر نہ جائیں (خروج باب ٢٠ آیت ۱۹) اس پر خدا تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے اچھا کہا ہے جب تک یہ ان احکام پر کاربند ہونگے برکت پائیں گے لیکن آئندہ جب کوئی نبی تیری مانند کھڑا کیا جائے گا (یعنی صاحبِ شریعت ہوگا) تو وہ ان کے بھائیوں میں سے ہوگا (یعنی ان میں سے نہ ہوگا) گو حضرت موسیٰ نے کہا ہے کہ تم میں سے تمہارے بھائیوں میں سے نبی کھڑا کیا جائے گا (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵) لیکن اوّل تو یہ خدا تعالیٰ کے اس کلام کے خلاف ہے جو اس نے موسیٰؑ سے کہا۔ کیونکہ اس میں "تم میں سے" کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ صرف یہی ہے کہ تیرے بھائیوں سے۔ دوم یہ فقرہ ہی بے معنی ہے کہ تم میں سے تمہارے بھائیوں میں سے جبکہ اس کلام کے سب بنی اسرائیل مخاطب تھے تو پھر تم میں سے کہکر تمہارے بھائیوں میں سے کہنا لغو تھا۔ جب بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا جائے گا کہ تمہارے بھائیوں سے نبی کھڑا کیا جائے گا۔ تو وہ بنی اسرائیل کے سوا کسی اور قوم میں سے ہوگا نہ ان میں سے۔ اور اگر ان میں سے ہو تو پھر بھائیوں سے نہیں کہلا سکتا۔

نیز عہد کی تجدید حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت

بنی اسرائیل پر اتمامِ نعمت والا عہد دوسرے انبیاء کے ذریعہ سے کئی بار دہرایا گیا۔

بنی اسرائیل کا خدا تعالیٰ کے کلام کو سننے سے انکار

سوم بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے نبی کھڑا کرنا تو سزا کے طور پر تھا۔ اگر انہیں میں سے نبی ہو۔ تو سزا نہیں رہتی۔ جیسا کہ استثناء باب ۱۸ آیت ۱۶ میں لکھا ہے "اس سب کی مانند جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے حورب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ میں پھر دیکھوں تاکہ میں مرنہ جاؤں" پھر لکھا ہے "اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا۔ سو اچھا کہا۔ میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا۔ اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالونگا۔ اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا" (آیت ۱۷ و ۱۸) اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ بنی اسرائیل نے خدا کا کلام سننے سے انکار کر دیا جو کلام کہ شریعت کے متعلق تھا تو آیندہ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے شریعت کا دروازہ بند کر دیا اور کہا کہ جب کسی ایسے نئے نبی کی ضرورت ہوگی جو موسیٰ کی مانند ہو تو وہ ان کے بھائیوں میں سے کھڑا کیا جائے گا۔ اس عہد کے ماتحت بنی اسرائیل کو ہر قسم کی ترقی ملتی رہی اور ان کی رُوحانی زندگی کے لئے بادشاہ ہوتے رہے۔ اور ان کو سوائے ایک قلیل درمیانی مدت کے ارضِ مقدس پر حکومت میسر رہی گو مسیح کے نزول کے بعد ارض مقدس کا قبضہ اس گروہ کے ہاتھ آگیا جو مسیح کا ماننے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اسی عہد کی طرف اہل کتاب کو متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم سے تمہارا ایک عہد تھا۔ جس کے پورا کرنے کی صورت میں ہم نے تم سے برکت کی زندگی کا وعدہ کیا تھا۔ تم اگر اس عہد کو پورا کرو۔ تو میں اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے تیار ہوں جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد کا ذکر قرآن کریم میں ہے جو اوپر گذر چکا ہے مذکورہ بالا موسوی عہد کا ذکر بھی قرآن کریم میں موجود ہے فرماتا ہے وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

بنی اسرائیل کے عہد پر قائم نہ رہنے سے ان سے نعمت کا چھن کر بنو اسمٰعیل میں آنا۔

موسوی عہد کا ذکر قرآن مجید میں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ۫ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (اعراف ع ۱۹) یعنی میری رحمت ہر ایک چیز پر وسیع ہے میں ضرور ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ کریں اور زکوٰۃ دیں اور ہماری آیات پر ایمان لائیں اسے لازم کر دونگا (خواہ وہ کسی قوم کے ہوں) ہاں ان لوگوں کے لئے جو اس رسول نبی اور اُمّی کی فرمانبرداری کرتے ہیں جسے وہ اپنی اپنی کتب تورات اور انجیل میں لکھا ہُوا پاتے ہیں وہ انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بُری باتوں سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے (برخلاف یہود کے جو بہت سی پاک چیزوں کو اپنی تنگ ظرفی کی وجہ سے حرام قرار دیتے ہیں) اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے (برخلاف نصاریٰ کے جو سؤر اور خون جیسی ممنوع اور بُری چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں) اور ان کے کمر توڑ دینے والے بوجھوں کو دُور کرتا ہے اسی طرح ان طوقوں کو بھی جو ان کے گلوں میں پڑے ہوئے ہیں پس وہ جو اس پر ایمان لاتے اور اپنی زبانوں اور تلواروں سے اسکی اعانت کرتے ہیں اور اسکی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ اُتارا گیا ہے (یعنی قرآن کریم) وہ ضرور کامیاب ہونگے یعنی باوجود غیر عرب ہونے کے ان برکات سے حصّہ پائینگے جو عرب کے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت سے وابستہ ہیں کیونکہ وہ کسی ایک قوم کا نبی نہیں بلکہ سب دُنیا کا نبی ہے چنانچہ اگلی آیت میں اس مضمون کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرماتا ہے قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا تو کہدے کہ اے لوگو

میں تم سب کی طرف خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں یعنی مجھ پر ایمان لانے والے سب کے سب ان انعامات کے وارث ہونگے جن کا مجھ سے وعدہ ہے اور صرف میری قوم ہی کے لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھائیں گے۔

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں ایک نبی امّی کا ذکر موجود ہے اور اس پر ایمان لانے کا حکم ہے اور اسکی اطاعت کے ساتھ خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کے پورا ہونے کا تعلق ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ان کی قوم سے کیا گیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جب وہ موعود نبی آئے گا تو اس وقت اس عہد کو جو موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے کیا گیا تھا اللہ تعالیٰ صرف انہی سے پورا کرے گا جو اس پر ایمان لائینگے چنانچہ لکھا ہے "میں ان کے لئے انکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا **اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لیکے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا**" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸، ۱۹)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کے متعلق جو وعدہ کیا تھا اس کا زمانہ اس موعود نبی کی بعثت تک تھا اس کی بعثت کے بعد یہ شرط تھی کہ اگر بنی اسرائیل اس نبی کو مانینگے تو انعام پائینگے ورنہ سزا پائینگے اور اسی طرف اشارہ ہے اس آیت میں کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ تم اپنا عہد مجھ سے پورا کرو تو میں اپنا عہد تم سے پورا کرونگا۔

اس جگہ دو شبہات پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ ہر نبی کے منکروں کو ہی سزا ملتی ہے اور بنی اسرائیل میں موسیٰ کے بعد بہت سے نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذر چکے تھے جن کا انہوں نے انکار کیا پس عہد تو اس وقت ہی ٹوٹ چکا تھا پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پیشگوئی کا خاص تعلق کیونکر ہوا (۲) دوسرے یہ کہ اگر پیشگوئی محمد رسول اللہ صلعم کے متعلق تھی تو ان کی بعثت سے بنی اسرائیل کا زمانہ تو ختم ہو گیا پھر یہ کیوں کہا گیا ہے کہ تم اپنا عہد پورا کرو تو میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ بنی اسرائیل کے توبہ کر لینے سے نبوت ان کی قوم میں واپس تو جا سکتی تھی پھر یہ الفاظ کیوں کہے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ایک موعود نبی کی پیشگوئی

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی اسرائیل نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی بہت سے نبیوں کا انکار کیا لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ چونکہ ان کے قومی نبی تھے بعد میں ان کے حالات اور الہام ان کی مقدس کتب کے مجموعہ میں شامل ہو گئے پس وہ انکار عارضی تھا اس سے قومی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ اس وجہ سے قوم ان انبیاء کی معرفت آنے والے انعامات سے محروم نہ ہوتی تھی۔ انکی مثال ایسی ہی تھی جیسے کہ عرب نے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا لیکن آخر میں ان پر ایمان لے آئی ہاں آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار بنی اسرائیل نے شدت سے کیا اور بعد میں ان پر ایمان بھی نہ لائے لیکن بہر حال وہ بھی اسرائیلی نبی تھے اور بنی اسرائیل کا وہ حصہ جو ان پر ایمان لایا اس عہد کے تسلسل کو قائم رکھنے والا تھا اور اگر وہ اپنے عہد کو قائم رکھتا تو نبوت کا انعام پھر بھی ان کو ملتا لیکن انہوں نے بھی اس عہد کو قائم نہ رکھا اور نبوت دوسری طرف منتقل ہو گئی۔

بنی اسرائیل کے عہد کے توڑنے کے متعلق شبہ کا ازالہ

یہود نے تو عہد کے روحانی پہلو کو بھلا کر یعنی دل کی پاکیزگی کو نظر انداز کر کے خدا تعالیٰ سے عہد کو توڑ دیا اور جو بنی اسرائیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے انہوں نے ظاہری ختنہ کو چھوڑ کر عہد کے نشان کو مٹا دیا پس اس طرح بنی اسرائیل کا کوئی حصہ بھی عہد پر قائم نہ رہا اور خدا تعالیٰ نے عہد کو بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی بنی اسرائیل نے نبیوں کا انکار کیا لیکن وہ انکار عارضی ہوتا تھا اور بعد میں وہ اس نبی کو قومی نبی کے طور پر تسلیم کر لیتے تھے سوائے حضرت مسیحؑ کے کہ جن کو بنی اسرائیل کی باقی قوم نے قبول نہ کیا لیکن چونکہ وہ اسرائیلی نبی تھے اسرائیل ہی کی طرف آئے تھے اور جیسا کہ اناجیل سے ثابت ہے موسوی شریعت پر چلنے کا ہی حکم دیتے تھے اور ان کے پہلے مومن اسرائیل میں سے ہی تھے اس لئے ان پر ایمان لانے والے اسرائیلیوں کے ذریعہ سے وہ وعدہ قومی طور پر پورا ہوتا رہا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور رنگ کا تھا۔ آپ موسوی شریعت کے تابع نہ تھے بلکہ موسیٰؑ کی پیشگوئی کے مطابق ایک نئی شریعت لائے تھے اور اسرائیل کی طرف مبعوث نہ تھے بلکہ سب دنیا کی طرف مبعوث تھے پس آپ کے ذریعہ سے جو دین قائم ہوا وہ موسوی دین کا تسلسل نہ تھا اور اسرائیل اس پر قومی فخر نہ کر سکتے تھے اور ان کی قومی برتری کا دَور اس سے ختم ہو جاتا تھا اس لئے فرمایا گیا کہ چونکہ تم نے اپنا عہد توڑ دیا ہم نے بھی اپنا عہد ختم کر دیا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ گو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اسرائیلی نبیوں کا تسلسل ٹوٹ گیا اور بنی اسرائیل کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے وہ تسلسل پہلی شکل میں پھر قائم نہ ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ کے ارشاد کے مطابق بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ کی رحمتوں کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (مائدہ ع ۹ و ع ۱۰) یعنی اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ سے کام لیتے تو ہم ان کی غلطیوں پر پردہ ڈال دیتے اور ہم انہیں نعمت والی جنتوں میں جگہ دیتے اور اگر وہ تورات کو قائم کرتے اور انجیل کو اور اس کلام کو بھی جو ان پر (یعنی موجودہ زمانہ کے اہل کتاب پر) ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے یعنی روحانی غذا کے دروازے ان کے لئے کھولے جاتے اور آسمانی الہام ان پر نازل ہوتا وہ اپنے قدموں کے نیچے سے بھی کھاتے یعنی مادی انعامات بھی ان پر نازل ہوتے۔ ان میں سے ایک جماعت میانہ رو ہے (یعنی جو اسلام لے آئے ہیں) اور اکثر ان میں سے بُرے عمل کرتے ہیں۔ اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے اسے پوری طرح پہنچا اور اگر تُو ایسا نہ کرے گا تو گویا تُو نے کوئی حصہ بھی کلام الٰہی کا نہیں پہنچایا اور اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں کے حملوں سے بچائیگا اللہ تعالیٰ کافروں کو کامیابی کا راستہ کبھی نہیں دکھاتا۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تورات اور انجیل کے ماننے والے اگر ان کی تعلیم کو مانتے ہوئے اس کلام کو جو آخری زمانہ میں ان کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے مان لیں اور ایمان اور تقویٰ سے کام لیں تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے الہام اور رزق طیب کا دروازہ کھول دے گا اور اپنی سابق بدیوں کے عذاب سے وہ محفوظ ہو جائینگے گویا اس رنگ میں اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو ان سے پُورا کرے گا اور اُن کو آسمانی و دنیاوی انعامات سے متمتع کرے گا پھر فرمایا ہے کہ اے رسول ان اقوام کو خوب تبلیغ کرتا ان پر حجت پوری ہو جائے اور ان میں سے جو بچائے جا سکیں بچائے جائیں

پس گو نبوت حسب پیشگوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے نکالکر بنی اسمٰعیل میں آگئی لیکن پھر بھی اگر بنی اسرائیل اپنے عہد کو پورا کرنے میں لگ جائیں تو ان کے لئے خدا تعالیٰ اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے تیار ہے. استثنا ر باب ۱۸ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اس آیت میں ایک لطیف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی ہدایت کے بعد یہ آیت رکھی گئی ہے کہ اے رسول جو تجھ پر نازل کیا گیا ہے سارا کا سارا پہنچا دے اور یہی الفاظ استثنا ر کی پیشگوئی کے آخر میں ہیں کیونکہ وہاں لکھا ہے "اور جو کچھ میں اسے فرماؤنگا وہ سب ان سے کہے گا" (باب ۱۸ آیت ۱۸)

آیت اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ سے یہ استدلال بھی ہوتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ میں غیر تشریعی نبوت کا دروازہ بند نہیں اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے فرماتا ہے کہ اگر تم میرا عہد پورا کرو یعنی خدا کی باتوں کو مان لو اور وقت کے نبی محمد رسول اللہ پر ایمان لاؤ تو پہلے جو تم سے عہد کیا تھا وہ میں پھر تم سے پُورا کروں گا اور اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ عہد یہ تھا کہ ان سے نبی پیدا ہوتے رہیں گے پس معلوم ہوا کہ اُمتِ محمدیہ میں نبوت کا دروازہ مسدود نہیں صرف شریعت ختم ہوئی ہے ورنہ بے شریعت والے اور قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع اور خادم نبی اب بھی پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ اگر ایسا ممکن نہ تھا تو اللہ تعالیٰ کے اس قول کے کیا معنے ہوئے کہ اگر اب بھی تم اپنا عہد پورا کرو تو میں تم سے اپنا عہد پورا کروں گا یہ قول اسی وقت درست ہو سکتا ہے جبکہ اُمتِ محمدیہ میں نبوت کا دروازہ کھلا ہو اور بنی اسرائیل میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو اس کا وعدہ دیا جائے.

یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مذکورہ بالا پیشگوئی کے مطابق بنی اسرائیل میں آیندہ شرعی نبوت کا دروازہ مسدود ہو چکا تھا اور صرف موسوی شریعت کے تابع نبوت کا دروازہ کھلا تھا کیونکہ استثنا ر باب ۱۸ آیت ۱۸ میں صاف لکھا تھا کہ شریعت والا نبی آیندہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنو اسمٰعیل میں سے آئے گا پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی ان میں بغیر شریعت کے نبی آتے تھے اور نبوت محمدیہ پر ایمان لانے کے بعد بھی یہ دروازہ ان کے لئے بند نہ تھا پس فرمایا کہ اگر اب بھی اپنے عہد کو پورا کرنے لگو تو اس انعام سے حصہ پا سکتے ہو.

اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ [2]

وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ پس مجھ ہی سے ڈرو مگر یہ پورے معنے اس جملہ کے نہیں کیونکہ اِیَّایَ مفعول ہے اور اس کا فعل محذوف نکالنا ضروری ہے جو اگلے الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے اِرْهَبُوْا ہے پس وَاِیَّایَ کے معنے ہوئے اور ڈرو مجھ سے اس کے بعد فا آیا ہے جو امر محذوف پر دلالت کرتا ہے اور وہ امر بھی عبارت کے مطابق ہی نکالنا ہوگا اور وہ اِرْهَبُوْا ہی ہو سکتا ہے پس محذوف کو ظاہر کرکے عبارت یہ ہوگی وَاِرْهَبُوْا اِیَّایَ اِرْهَبُوْا فَارْهَبُوْنِ. اور ترجمہ یہ ہوگا کہ اور مجھ ہی سے ڈرو ڈر جاؤ پس مجھ ہی سے ڈرو گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے خوف کو تین دفعہ بیان کیا گیا ہے

آیت اَوْفُوْا بِعَهْدِیْ سے یہ استدلال کہ اُمتِ محمدیہ میں غیر تشریعی نبوت کا دروازہ بند نہیں.

اس جگہ بعض مغرب کے فلسفہ سے متأثر لوگوں کو شائد یہ وہم ہو کہ خدا تعالیٰ کے خوف پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے ایسے لوگوں کا ایک جواب تو یہ ہے کہ خوف بُری چیز نہیں خوف تقویٰ کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے انسان مختلف حالتوں کے ہوتے ہیں بعض محبت سے مانتے ہیں اور بعض خوف سے. پس جس ہستی کے مدنظر اصلاح ہوگی وہ خوف اور محبت دونوں سے کام لے گی. فلسفہ انسان کی اصلاح نہیں کر سکتا اصلاح تو مرض کے مطابق علاج کرنے سے ہوتا ہے پس جو لوگ گندے ہو چکے ہوں ان کو ان کے عیوب کے بدنتائج سے ڈرا کر ہی انکی اصلاح کی جا سکتی ہے جو اس طریق کو استعمال

اس وہم کا ازالہ کہ خدا تعالیٰ کے خوف پر کیوں زور دیا جاتا ہے.

وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ

(اور) جو اس (کلام) کو جو تمہارے پاس ہے سچا کرنے والا ہے۔ اور تم اسکے (سب سے) پہلے کافر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے میں

ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ○ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ

تھوڑی قیمت مت لو۔ اور مجھ (ہی) سے (ڈرو) پھر (میں کہتا ہوں کہ) مجھ (ہی) سے ڈرو ۴۲ اور جانتے بوجھتے ہوئے حق کو

اٰمَنُوْا ۲ نہ کرے گا۔ اصلاح کے کام میں ناکام رہے گا۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ رَھْبٌ کے معنے عام خوف کے نہیں بلکہ رَھْبٌ کے معنوں میں کوشش اور جدوجہد کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے چنانچہ عرب کہتے ہیں رَھِبَتِ النَّاقَةُ اور اس کے معنے ہوتے ہیں جَهَدَهَا السَّيْرُ یعنی اونٹنی خوب دوڑائی گئی اور تھک گئی۔ پس رَھْبٌ اس خوف کو کہتے ہیں جو کام کی طرف رغبت پیدا کرے اسی وجہ سے عابد لوگوں کو راہب کہتے ہیں۔

اَنْزَلْتُ ۳

مُصَدِّقًا ۴

ایک اور شبہ کا ازالہ بھی میں اس جگہ کر دینا چاہتا ہوں کہا جا سکتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ تو بڑے بھائی تھے انکی نسل کو ایک لمبے عرصہ تک اللہ تعالیٰ نے انعام سے کیوں محروم رکھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بنو اسحاق کو بعد میں کیسے ہی بگڑے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سینکڑوں سال تک انہوں نے دین کی شمع کو اٹھائے رکھا اس لئے وہ یقیناً خدا تعالیٰ کے خاص فضلوں کے وارث ہوئے۔ بنو اسمٰعیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک اس رتبہ کو نہیں پہنچے اس لئے بقدر ضرورت ہی انہیں انعام ملا۔ ہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے جوہر کامل بنو اسمٰعیل میں سے ہوئے کہ جنہوں نے سب کمی کو پورا کر دیا۔ اور چونکہ آپ خاتم النبیین ہونے والے تھے اس لئے ضروری تھا کہ سب دوسرے انبیاء کو جو براہ راست نبوت کے مقام پر کھڑے ہونے والے تھے پہلے گذرنے دیا جاتا تا آخر میں آپ تشریف لاتے اور شریعت والی اور براہ راست نبوت کا دروازہ مسدود کر دیا جاتا۔

اس سوال کا جواب کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل کو ایک لمبے عرصہ تک انعام سے کیوں محروم رکھا گیا؟

كَافِرٍ ۵

لَا تَشْتَرُوْا ۶

بِاٰيٰتِيْ ۷

اَلثَّمَنَ ۸

۴۲ حل لغات:- اٰمِنُوْا: امر حاضر جمع کا صیغہ ہے مزید تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورۂ ہذا ۴ و ۱۴۔

اَنْزَلْتُ:- اَنْزَلَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اَنْزَلَ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵

مُصَدِّقًا:- صَدَّقَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور صَدَّقَهٗ کے معنے ہیں ضِدُّ كَذَّبَهٗ اسے سچا قرار دیا اور اَلتَّصْدِيْقُ کے معنے ہیں نِسْبَةُ الصِّدْقِ بِالْقَلْبِ اَوِ اللِّسَانِ اِلَى الْقَائِلِ۔ کسی بات کرنے والے کو اسکی بات میں دل سے سچا سمجھنا یا زبان سے سچا قرار دینا۔ وَقِيْلَ هُوَ اَنْ تُنْسِبَ بِاخْتِبَارِكَ الصِّدْقَ اِلَى الْمُخْبِرِ اور بعض نے تصدیق کے یہ معنے کئے ہیں کہ اپنے اختیار سے سوچ سمجھ کر مخبر کی طرف صدق کا منسوب کرنا تصدیق کہلاتا ہے۔ نیز لکھا ہے اَلْمُصَدِّقُ۔ اَلَّذِيْ يُصَدِّقُكَ فِيْ حَدِيْثِكَ کہ جو کسی کی باتوں کو سچا قرار دے اسے اس کا مصدق کہیں گے (اقرب)

كَافِرٍ:- كَفَرَ سے اسم فاعل ہے اور كَفَرَ کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۷ و ۲۵

لَا تَشْتَرُوْا:- نہی مخاطب کا جمع کا صیغہ ہے اِشْتَرٰى کے معنے کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ۱۷

بِاٰيٰتِيْ:- اٰيٰتٌ اٰيَةٌ کی جمع ہے اٰيَةٌ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۴۰

اَلثَّمَنَ:- مَا فَدَرَهٗ الْعَاقِدَانِ عِوَضًا

لِلْمَبِيْعِ کہ خرید و فروخت کرنے والے جو کسی چیز کی قیمت ٹھہراتے ہیں وہ ثمن کہلاتی ہے (اقرب) مفردات میں ہے اَلثَّمَنُ اِسْمٌ لِمَا يَأْخُذُهُ الْبَائِعُ فِيْ مُقَابَلَةِ الْمَبِيْعِ عَيْنًا كَانَ اَوْ سِلْعَةً کہ ثمن اس چیز کو کہتے ہیں جس کو بیچنے والا بیچی ہوئی چیز کے بدلہ میں لیتا ہے خواہ نقدی کی صورت میں ہو یا سامان کی وَكُلُّ مَا يَحْصَلُ عِوَضًا عَنْ شَيْءٍ فَهُوَ ثَمَنُهٗ ہر وہ چیز جو کسی چیز کے عوض حاصل کی جائے اس پر بھی ثمن کا لفظ بول دیا جاتا ہے (مفردات) لسان میں لکھا ہے کہ اَلثَّمَنُ مَا تَسْتَحِقُّ بِهِ الشَّيْءَ ثمن ہر اس چیز پر بولینگے جس کے ذریعہ کسی دوسری چیز کے لینے کا حق ہو جائے وَالثَّمَنُ ثَمَنُ الْبَيْعِ وَثَمَنُ كُلِّ شَيْءٍ قِيْمَتُهٗ کہ ثمن کا لفظ کسی چیز کی اس قیمت پر بھی بولا جاتا ہے جو اس کو لینے کے لئے ادا کی جائے اور اس پر بھی بولا جاتا ہے جو کسی چیز کی اصل قیمت ہو (یعنی بعض اوقات ایک چیز کی اصل قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن بکتی کم قیمت پر ہے تو اصل قیمت پر اور اس قیمت پر جس پر وہ بک رہی ہوتی ہے ثمن کا لفظ بولا جاتا ہے) فرا رکہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں بھی ثمن پر نصب آئی ہے اور مبیع پر باء داخل کی گئی ہے وہاں ان دونوں میں سے کوئی بھی معین ثمن نہیں ہوتی۔ ہر دو اشیاء میں سے جس کو چاہیں ثمن بنا سکتے ہیں مثلاً جب یہ کہیں کہ اِشْتَرَيْتُ ثَوْبًا بِكِسَاءٍ کہ میں نے چادر دے کر کپڑا خریدا۔ تو اس میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ *کپڑا چادر کی قیمت ہے گویا ہر دو اشیاء ایک دوسرے کی قیمت بن سکتی ہیں اور جب یہ بتانا مقصود ہو کہ فلاں چیز اتنی رقم سے خریدی گئی ہے اور وہاں مال کا ذکر ہو تو اس وقت مال کو ثمن کہیں گے اور اس پر باء داخل ہوگی جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق آتا ہے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ کہ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو چند دراہم دیکر خرید لیا تو یہاں دراہم ثمن بن سکتے ہیں (لسان)

اِتَّقُوْنِ اِتَّقُوْنِ:۔ اِتَّقُوْا امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے نِ ی کا قائمقام ہے۔ اِتَّقُوْنِ کے معنے ہیں مجھ سے ڈرو اِتَّقٰی کی تشریح کے لئے دیکھو حل لغات سورہ ہذا ٣؎

تفسیر:۔ اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْ کے معنے استثناء باب ۱۸ کے موعود نبی کو قبول کرنا ہے کیونکہ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْ کے بعد اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلْتُ کہا گیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایفاء عہد اور خدا تعالیٰ کا خوف اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی پر ایمان لانا یہ سب امور ان انعامات کی تکمیل کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے والے ہیں جو بنی اسرائیل کے لئے مقرر تھے۔

بِمَا اَنْزَلْتُ۔ اَنْزَلْتُ کے بعد ضمیر واحد غائب محذوف ہے کیونکہ مَا کی طرف ضمیر کا پھرنا ضروری ہے پس اصل جملہ یہ ہوگا بِمَا اَنْزَلْتُهٗ یعنی اس پر ایمان لاؤ جسے میں نے نازل کیا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: یہ جملہ اَنْزَلْتُ کے بعد جو ضمیر محذوف ہے اس کا حال ہے اور مطلب یہ ہے کہ میرے اتارے ہوئے اس کلام پر ایمان لاؤ جو اس کا جو تمہارے پاس ہے مصدق ہے مطلب یہ ہے کہ اس کلام کے ذریعہ سے موسیٰ علیہ السلام کی استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ والی پیشگوئی پوری ہوئی ہے اسی طرح اور بنی اسرائیل کے نبیوں کی پیشگوئیاں پوری ہوئی ہیں پس اس کلام اور اس کے لانے والے پر ایمان لانا اپنے سابق الہامی کلام کی تصدیق کرنا ہے اور اس کے حکم پر عمل کرنا ہے اور اس کو نہ ماننا اس کلام کی تکذیب اور تردید ہے گویا بنی اسرائیل میں سے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیشکردہ کلام الٰہی قرآن کریم پر ایمان لاتا ہے وہ حضرت موسیٰ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں پر بھی ایمان لاتا ہے کیونکہ انہوں نے انکی خبر دی تھی اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر نازل شدہ کلام کو رد کرتا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کو بھی رد کرتا ہے

حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہ کی بنو اسمٰعیل کی ترقی کے متعلق پیشگوئیاں۔

کیونکہ وہ ان کی تصدیق کو ٹھکرا دیتا ہے۔ پس وہ ان انعامات کا مستحق نہیں رہتا جو ان کی تصدیق اور ان پر ایمان لانے سے وابستہ کئے گئے تھے۔

ایک غیر مسلم سوال کر سکتا ہے کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اور ان کے بعد میں آنے والے انبیاء نے واقعہ میں کسی ایسے نبی کی خبر دی تھی جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے پورا کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دُنیا کی ہر قوم میں ایک آخری زمانہ کے نبی کی خبر دی گئی تھی اور اس کی بعض علامات بھی بتائی گئی تھیں جو پورے طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پوری ہو گئیں خصوصاً اسرائیلی نبیوں کی پیشگوئیاں تو اس بارہ میں بکثرت ملتی ہیں اس کثرت سے کہ ان پر ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اس آیت میں سب انبیاء اور اقوام کی پیشگوئیوں کا ذکر نہیں اس لئے اس وقت مَیں ان کو بیان نہیں کرتا لیکن مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کے مضمون کی مطابقت سے بنی اسرائیل کے نبیوں کی پیشگوئیوں کا ذکر چونکہ ضروری ہے مَیں اختصار کے ساتھ ان کا ذکر اس جگہ کرتا ہوں۔

قرآن مجید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تورات اور انجیل کی سات تصدیقات۔

تصدیق نمبر ۱ پہلی تصدیق قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کرتا تھا جنہوں نے بنو اسمٰعیل کی ترقی کی پیشگوئی کی تھی اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے اور آپ پر وحی نازل نہ ہوتی تو حضرت ابراہیم جھوٹے قرار پاتے۔ حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ "اسمٰعیل کے حق میں یعنے تیری سُنی دیکھ مَیں اسے برکت دُونگا اور اسے برومند کرونگا اور اسے بہت بڑھاؤنگا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور مَیں اسے بڑی قوم بناؤنگا" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰)

قرآن کی پہلی تصدیق حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیوں کی

اس پیشگوئی سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اسحاق کی اولاد سے وعدہ تھا کہ انہیں بہت بڑھاؤنگا اور اسے برکت دُونگا اور اس سے بڑی قوم بناؤنگا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق بھی وعدہ تھا گو باوجود اس کے بائبل میں لکھا ہے کہ یہ عہد اسحاق کی اولاد سے پورا ہوگا مگر یہ تو قلم درکفِ دشمن کی وجہ سے ہے ورنہ ساری باتیں جو حضرت اسحاق کی نسبت کہی گئی تھیں حضرت اسمٰعیل کی نسبت بھی کہی گئیں۔ تو پھر عہد کا حضرت اسحاق سے مخصوص ہونا بے معنی ہے بائبل کے قول کے مطابق خدا کا کلام حضرت ہاجرہ پر بھی نازل ہُوا تھا اور اس میں اسمٰعیلؑ کی نسبت یہ پیشگوئی تھی "مَیں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی اور خداوند کے فرشتے نے اسے کہا کہ تُو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا وہ وحشی آدمی ہوگا اس کا ہاتھ سب کے ، اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہونگے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔" (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۰ تا ۱۲) گو یہ الہام ہاجرہؓ پر نازل ہُوا ہے مگر موسیٰ کی وحی میں اسے شامل کر کے اسکے خُدائی الہام ہونے کی تصدیق کر دی گئی ہے پس یہ الہام بھی اسی طرح بنی اسرائیل پر حجت ہے جس طرح حضرت ابراہیم کا اپنا الہام۔ اس الہام میں یہ امور بیان ہیں کہ (۱) حضرت اسمٰعیل کی اولاد بھی حضرت اسحاق کی اولاد کی طرح بے انتہا ترقی کریگی حتّٰی کہ گنی نہ جاسکے گی (۲) اسے ایسی عظمت ملے گی کہ سب دُنیا اس سے حسد کریگی (۳) باوجود اسکے کہ سب دُنیا اس کی مخالفت کرے گی وہ ان سے دبے گی نہیں بلکہ ان کے مقابل پر عزت کی زندگی بسر کرے گی۔

اس پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ بنو اسمٰعیل کے لئے عالمگیر عزت شہرت اور عظمت مقدر کی گئی تھی اس قدر کہ اس کے نتیجہ میں دُنیا کی سب قومیں ان سے حسد کرنے لگینگی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق آکر یہی دعویٰ کیا کہ وہ ایسی عظمت حاصل کرینگے کہ سب دُنیا ان پر حسد کرنے لگے گی خصوصاً بنو اسحاق۔ اور یہ کہ آپ کو سب دُنیا پر خدا تعالیٰ غلبہ دے گا۔ اس دعویٰ کے ساتھ گویا آپ نے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ کے الہاموں کو پورا کرنے کا دعویٰ کیا اگر آپ ظاہر نہ ہوتے تو ظاہر ہے کہ نہ ابراہیم علیہ السلام

کی وہ پیشگوئی پوری ہوتی جو انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے بارہ میں کی تھی اور نہ ہاجرہ پر نازل ہونے والا الہام. جو بائبل میں موجود ہے پورا ہوتا مگر رسول کریمؐ کی بعثت کے ساتھ یہ دونوں الہام پورے ہوگئے اور قرآن کریم بائبل کا مصدق ہوگیا یعنی اس کے الہام کو سچا کرنے والا۔

یہ جو بائبل میں ہے کہ حضرت اسحاق اس عہد کو پورا کرنے والے ہونگے جو حضرت ابراہیمؑ سے ہوا تھا اس کا ایک جواب تو میں پہلے دے آیا ہوں کہ بائبل انسانوں کی دست بُرد سے پاک نہیں بنو اسحاق کو بنو اسمٰعیل سے سخت عداوت تھی۔ پس جو کتاب زمانہ جہالت میں ایک لمبے عرصہ تک ان کے ہاتھوں میں رہی خدا ہی جانے کہ اس میں انہوں نے کیا کیا تحریف کی ہوگی. دُور جانے کی ضرورت نہیں. بائبل کے وہ نسخے جو عزرا نبی کے بعد تاریکی زمانہ میں لکھے گئے ہیں ان میں ہی کافی اختلاف ہے یہودیوں سامریوں اور مسیحیوں کی بائبل کے نسخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے گو اصولی طور پر وہ متفق ہیں لیکن پھر بھی کافی اختلاف موجود ہے جب یہ اختلاف تاریکی زمانہ کا ہے تو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ عزرا نبی سے پہلے زمانہ میں کیا کیا دست بُرد یہودی کتب میں کرچکے ہونگے۔

اگر اس دست برد کو نظرانداز بھی کردیا جائے تب بھی میں کہتا ہوں کہ ان پیشگوئیوں کو دیکھتے ہوئے جو حضرت اسمٰعیل کے حق میں بائبل میں اس وقت تک موجود ہیں ہم جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو بائبل میں لکھا ہے کہ "لیکن میں اسحاق سے جس کو سرہ دوسرے سال اسی وقت معین میں جنے گی اپنا عہد قائم کرونگا" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۱) اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ یہ عہد ابتداءً اسحاق کی اولاد کے ذریعہ پورا ہونا شروع ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہُوا کہ پہلے یہ عہد ایک لمبے عرصہ تک بنو اسحاق کے ذریعہ سے پُورا ہوتا رہا پھر خدا تعالےٰ نے اسے بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل کردیا۔

اور اس امر کی وجہ کہ گو اسحاق چھوٹے تھے مگر خدا تعالیٰ کا عہد پہلے ان کی اولاد کے ذریعہ سے پُورا ہونا شروع ہُوا ہے یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کو وہ نبوت ملنی تھی جو منسوخ نہ ہونے والی تھی اگر ان کے ذریعہ سے پہلے عہد پورا ہوتا تو بنو اسحاق نعمت سے بالکل محروم رہ جاتے پس اللہ تعالےٰ نے پہلے بنو اسحاق کو ایک لمبے عرصہ تک نبوت کے انعام سے حصّہ دیا اس کے بعد بنو اسمٰعیل میں وہ نبی مبعوث فرمادیا جو خاتم النبیین تھا اور جس کی شریعت کو کسی اور شریعت نے منسوخ نہ کرنا تھا بلکہ اس نے قیامت تک دُنیا پر حکومت کرنی تھی۔

اس امر کا قطعی ثبوت کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے جو عہد تھا اس میں حضرت اسمٰعیل کی اولاد بھی شامل تھی اس سے ملتا ہے کہ جس طرح عہد کا ظاہری نشان بندوں کی طرف سے ختنہ قرار دیا گیا تھا اسی طرح عہد کا ظاہری نشان خدا تعالیٰ کی طرف سے کنعان کی حکومت قرار دیا گیا تھا. بائبل کا حوالہ میں اوپر نقل کر آیا ہوں لیکن اس جگہ مضمون کو واضح کرنے کے لئے پھر لکھ دیتا ہوں لکھا ہے "اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پُشت در پُشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہو کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہونگا اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے مِلک ہو اور میں ان کا خدا ہونگا. پھر خدا نے ابراہام سے کہا کہ تُو اور تیرے بعد تیری نسل پُشت در پُشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو. سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جاوے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا. جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔" (پیدائش باب ۱۷ آیت ۷ تا ۱۱) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ عہد خداوندی کے مادی حصہ کی دو شقیں تھیں ایک شق اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی تھی اور وہ آل ابراہیمؑ کو کنعان کی بادشاہت دینے کا وعدہ تھا. اور دوسری شق آل ابراہیم سے تعلق رکھتی تھی اور وہ ختنہ کرنے کی رسم تھی خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ ہمیشہ آل ابراہیم

کے پاس کنعان رہے گا اور آل ابراہیم سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی ہمیشہ نرینہ اولاد کا ختنہ کرائیں۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ خدا تعالیٰ نے کنعان یہود سے لے کر مسیحیوں کو دے دیا بوجہ اس کے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اسرائیلی نبی تھے اس وقت بھی پیشگوئی قائم رہی اور کنعان آل ابراہیم کے قبضہ میں ہی رہا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے معاً بعد سے لے کر ۱۹۱۷ء تک اندازاً تیرہ سو سال تک یہ ملک مسلمانوں کے پاس رہا اگر تو بنو اسمٰعیل آل ابراہیم کے وعدہ میں شامل نہ تھے اور پھر بھی یہ ملک تیرہ سو سال ان کے اتباع کے قبضہ میں رہا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی قطعاً باطل ٹھہرتی ہے لیکن چونکہ خدا کی بات جھوٹی نہیں ہو سکتی ثابت ہوا کہ بنو اسمٰعیل عہد ابراہیم میں بنو اسحاق سے برابر کے شریک تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کی پیشگوئیاں بنو اسمٰعیل کے متعلق آنحضرتؐ کے وجود میں پوری ہوئیں۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی اس فعلی شہادت سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ عہد ابراہیم میں بنو اسمٰعیل بھی شامل تھے اس وجہ سے ان کے قبضہ میں کنعان کا آنا عہد الٰہی کے پورا ہونے کے تسلسل میں تھا۔ تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عہدِ الٰہی کا رُوحانی حصہ یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے نبوت کا ملنا اور بندہ کی طرف سے دل کا ختنہ کرنا بھی بنو اسمٰعیل کے حق میں پورا ہونا ضروری تھا اور یہ ایفاء عہد خدا تعالیٰ اور بندہ کی طرف سے جہاں تک بنو اسمٰعیل کا تعلق ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پورا ہُوا ورنہ بنو اسمٰعیل میں سے کوئی اور ایسا وجود پیش کیا جائے جس کی ذات سے یہ وعدہ پورا ہُوا ہو۔

قرآن کریم اور آنحضرتؐ کا موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کرنا

تصدیق نمبر ۲ دوسری تصدیق قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی کی۔

(۱) کتاب استثناء میں لکھا تھا "میں ان کے لئے انکے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہیگا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہیگا نہ سُنے گا تو مَیں اس کا حساب اس سے لُوں گا لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا مَیں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جاوے" (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۲۱)

اس پیشگوئی میں خبر دی گئی تھی کہ (الف) آیندہ بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنو اسمٰعیل میں سے ایک نبی کھڑا کیا جائے گا (باء) وہ موسیٰ کی مانند ہوگا یعنی صاحب شریعت ہوگا اور اس کے واقعات حضرت موسیٰ کے واقعات سے ملتے جُلتے ہونگے (ج) اس کی زبان پر خدا تعالیٰ کا کلام جاری ہوگا یعنی اس کا الہام کُل کا کُل لفظی ہوگا یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کے حکم کو اپنے الفاظ میں بیان کرے (د) وہ خدا تعالیٰ کے کلام کو نڈر ہو کر لوگوں کے سامنے بیان کرے گا اور سارا کلام الٰہی لوگوں کو سنائے گا (ھ) اور جو الہام سُنائے گا خدا کا نام لے کر سُنائے گا اور شرک کی تردید کرنے والا ہوگا (و) اس کے مُنکر عذاب الٰہی میں مبتلا ہونگے (ز) اگر کوئی شخص اس پیشگوئی کا جھوٹا مصداق بننے کی کوشش کرے گا تو خدا تعالےٰ کا فیصلہ ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے (یاد رہے کہ انگریزی زبان میں اس جگہ یہ الفاظ ہیں He shall die یعنی وہ ہلاک ہوگا نہ کہ وہ قتل کیا جائے جیسا کہ اُردو میں ہے)

ان پیشگوئیوں کے مطابق (الف) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنو اسمٰعیل میں سے یعنی بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے ظاہر ہوئے۔

(باء) آپ نے مثیل موسیٰ ہونے کا دعویٰ کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ (مزمل عٓ) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھجوایا ہے جو تم پر گواہ ہے اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھجوایا تھا یعنی موسیٰؑ۔ آپ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحب شریعت نبی تھے اور آپ کے حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑی مشابہت

رکھتے ہیں یعنی ایک کامل شریعت آپؐ کو دی گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپؐ سے وعدہ کیا گیا کہ آپؐ کی امت میں سے متواتر مجدد دین آتے رہیں گے اور یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آخری خلیفہ حضرت مسیح تھے اسی طرح قریباً اتنا ہی عرصہ آپؐ کے بعد ایک آپ کا خلیفہ ظاہر ہوگا جو مسیح کے نام سے موسوم کیا جاسکے گا چنانچہ اس پیشگوئی اور مشابہت کے مطابق حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنا ہی عرصہ بعد بانی سلسلہ احمدیہ مسیح موعود بن کر خدا تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوئے (ج) آپ نے دعویٰ کیا کہ خدا تعالیٰ کا کلام آپ کی زبان پر جاری ہے یعنی اپنی وحی کے جو الفاظ آپ پیش کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہ الفاظ ہیں جو آپ کے دل پر نازل ہوئے تمام گذشتہ نبیوں کی کتب کو بڑھ کر دیکھ لو ان میں خدا کا کلام کم اور بندہ کا زیادہ ہوتا ہے۔ انجیل میں تو شاید ایک دو فقرے ہی خدا کے ہیں باقی سب کچھ مسیح کا اپنا کلام یا انجیل کے داستان نویسوں کا نوشتہ ہے صرف قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے کہ الف سے یاء تک خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔

غرض میں اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا سے یہی مراد تھا کہ پہلے انبیاء کا سارا کلام لفظی نہ ہوتا تھا بلکہ اکثر حصہ ان کے دل پر بطور مفہوم نازل ہوتا یا بطور نظارہ دکھایا جاتا اور بعد میں وہ اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتے محمد رسول اللہ صلعم کی یہ خصوصیت اس پیشگوئی میں بتائی گئی کہ وہ خدا تعالیٰ کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان نہ کرینگے بلکہ خدا تعالیٰ کے مفہوم کو خدا تعالیٰ کے ہی الفاظ میں بیان کرینگے اور جو الفاظ وہ اپنے مُنہ سے خدا تعالیٰ کا منشاء بتانے کے لئے نکالیں گے وہ خود خدا تعالیٰ ہی کے الفاظ ہونگے پس فرمایا کہ میں اپنا کلام اسکے مُنہ میں ڈالوں گا یعنی باقی انبیاء کے تو دلوں پر کلام نازل ہوتا تھا اور مُنہ تک آتے ہوئے وہ نبیوں کے کلام کے لباس میں ملبوس ہو جاتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلعم کے دل پر بھی خدا تعالیٰ کا کلام اُتارا جائے گا اور مُنہ پر بھی وہی لفظ بعینہٖ جاری ہونگے جو خدا تعالیٰ نے کہے ہونگے اسی کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم ع ۱) محمد رسول اللہ اپنی مرضی سے خدا تعالیٰ کے منشاء کو الفاظ کا جامہ نہیں پہناتے بلکہ صرف وہی الفاظ وحی کے جو خدا تعالیٰ نے معین شکل میں ان کے دل پر نازل کئے ہیں دُنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں (د) آپؐ نے خدا تعالیٰ کے کلام کو نڈر ہو کر سُنایا اور سارا کلام سُنایا چنانچہ قرآن کریم کا وجود اسپر شاہد ہے شدید مخالفت آپؐ کی کی گئی اور کفار نے ہزار لالچ آپ کو دی کہ کسی طرح بعض حصے جو انکے بتوں کے خلاف تھے حذف کر دیئے جائیں یا کمزور کر دیئے جائیں مگر آپؐ نے ذرا انکی پروا نہیں کی اور خدا تعالیٰ کا کلام پورا کا پورا اصلی شکل میں لوگوں تک پہنچا دیا چنانچہ قرآن کریم میں اس کا ذکر یوں ہے فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (ہود ع ۱) یعنی تیرے مخالف اس امر کی طمع رکھتے ہیں کہ شائد ان کے ظلم و ستم سے تنگ آکر تو اس وحی میں سے جو تجھ پر نازل کی گئی ہے کچھ چھوڑ دے اور شائد کہ تیرا سینہ ان کے اس اعتراض سے ڈر کر کہ کیوں اس کے ساتھ خزانہ نہیں اُترا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ آسمان سے تائید کے لئے نہیں آیا بعض حصہ وحی کا چھوڑ دے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ تو ایک ڈرانے والا ہے۔ ڈرانے والا ان لوگوں سے کس طرح ڈر سکتا ہے جن کے متعلق تباہی کی خبر دی گئی ہے اور اللہ تو ہر چیز پر نگران ہے پھر اس کے حکم سے کوئی باہر کیونکر نکل سکتا ہے (اس آیت کی پوری تفسیر کے لئے دیکھو[۱۲] سورۂ ہود) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس امر پر شہادت دی اور لوگوں سے بھی دلوائی کہ آپؐ نے خدا تعالیٰ کا کلام سب کا سب دُنیا کو پہنچا دیا چنانچہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب آپؐ کو یہ قرآنی وحی ہوئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ ع ۱) آج میں نے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے تو آپؐ نے تمام مسلمانوں کے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی آنحضرتؐ کے متعلق

سامنے دوبارہ مسلمانوں کو انکے فرائض کی طرف توجہ دلائی اور پھر فرمایا اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ اے لوگو خدا تعالیٰ کو گواہ رکھ کر بتاؤ کیا میں نے خدا تعالیٰ کا حکم پوری طرح دنیا کو پہنچا دیا ہے یا نہیں؟ اسپر سب صحابہ یک زبان ہو کر بولے اَللّٰھُمَّ نَعَمْ ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ کر کے کہتے ہیں کہ آپ نے خدا تعالیٰ کا پیغام اچھی طرح پہنچا دیا ہے اسپر آپ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اے خدا تو اسپر گواہ رہ کہ یہ سب لوگ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ تبلیغ کلام الٰہی کا کام میں نے پورا کر دیا۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد سوم)

اس پیشگوئی کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ چونکہ موعود نبی خاتم النبیین ہونے والا تھا اسپر جو دینی وحی ہوگی دُنیا کو پہنچانے کے لئے ہوگی تا کہ دین کا کوئی حصّہ نامکمل نہ رہ جائے۔ اس سے پہلے کے نبیوں کا یہ حال نہ تھا ان پر دین کے بعض اسرار کھولے جاتے تھے مگر انھیں ان کے بتانے کی اجازت نہ ہوتی تھی کیونکہ انکے زمانہ کے لوگ اسکے سمجھنے کے قابل نہ ہوتے تھے گو نبی کا ترقی یافتہ دماغ اسے سمجھنے کے قابل ہوتا تھا۔ پس یہ کہنا کہ وہ نبی سب کچھ جو اسے کہا جائے گا لوگوں سے کہہ دے گا اس کے یہ معنے ہیں کہ اسکے زمانہ میں انسانی دماغ مکمل ہو چکا ہوگا اور آخری اور کامل شریعت جو تمام اسرار روحانی پر مشتمل ہوگی اسے دیدی جائیگی اور اسے حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنی اُمت کو سب باتیں سکھا دے کیونکہ وہ ان کے سُننے کے اہل ہیں ان معنوں کی طرف انجیل میں بھی اشارہ ہے حضرت مسیح فرماتے ہیں "میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں۔ پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنے رُوحِ حق آوے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتاوے گی"۔ (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲ و ۱۳) اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی سب وحی لوگوں کو نہ سُنائی کیونکہ وہ ان کے لئے خاص تھی انکی اُمت اسے سمجھنے کے قابل نہ تھی لیکن انہوں نے یہ خبر دے دی کہ انکے بعد ایک رُوحِ حق آئے گی وہ لوگوں کو سب باتیں سنا دیگی کیونکہ اس وقت لوگ سب باتوں کے سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے گویا وہ رُوحِ حق خاتم النبیین کے مقام پر فائز ہوگی۔

(ھ) پیشگوئی کا یہ حصّہ کہ وہ آنے والا جو کچھ کہیگا خدا کا نام لے کر کہے گا اس طرح پورا ہُوا ہے کہ قرآن کریم کی ہر سورۃ سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی آیت رکھی گئی ہے جس کے معنے ہیں میں اللہ جو رحمٰن و رحیم ہے اس کا نام لے کر اس کلام کو پیش کرتا ہوں (و) پیشگوئی کا یہ حصہ کہ اس کے منکر ہلاک ہونگے جس شان سے محمد رسول اللہ صلعم کی نسبت پورا ہُوا ہے اس کے دشمن بھی معترف ہیں گو وہ اسے دنیوی سامانوں کی طرف منسوب کرتے ہیں جو ایک خلافِ عقل و خلاف واقعہ اعتراض ہے (ز) پیشگوئی کا یہ حصہ کہ جو شخص اس پیشگوئی کا جھوٹا مصداق بنے گا اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے گا نہایت شان سے پورا ہُوا باوجود اسکے کہ محمد رسول اللہ صلعم اکیلے تھے اور ان کے دشمنوں نے انہیں ہلاک کرنے کے لئے پورا زور لگایا وہ ہر میدان میں کامیاب ہوئے اور کوئی شخص انہیں نقصان نہ پہنچا سکا اور یہ امر اتفاقی طور پر نہیں ہُوا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ نے پہلے سے کہدیا تھا اور دُنیا کو یہ حکم سُنا دیا گیا تھا کہ وَ اللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ ع ۱۰)

آپ کا دشمنوں کے منصوبوں سے غیر معمولی طور پر محفوظ رہنا ایک ایسا نشان ہے کہ بہت سے سخت دشمنوں کی ہدایت کا موجب ہُوا ہے چنانچہ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ہند ابوسفیان کی بیوی فتح مکہ کے بعد جب دوسری عورتوں سے مِلکر بیعت کرنے کے لئے آئی اور آپ نے عورتوں سے اقرار لیا کہ ہم شرک نہیں کرینگی اسپر ہند جوش سے بول پڑی کہ کیا ہم اب بھی شرک کر سکتی ہیں حالانکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ تو اکیلا تھا اور ہم لوگ ایک مضبوط جتھا تھے ہم نے اپنا سارا زور تجھے تباہ کرنے کے لئے خرچ کیا لیکن باوجود اسکے تجھے ہلاک نہ کر سکے اگر بُتوں میں کوئی بھی طاقت ہوتی تو ہم تجھے تباہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے مگر نتیجہ اُلٹا

نکلا ہم ہلاک ہوئے اور تو کامیاب (الروض الانف جلد دوم)

اب غور کرو کہ اگر بنو اسمٰعیل میں سے کوئی نبی شریعت کے ساتھ موسیٰ کے نقش قدم پر ظاہر نہ ہوتا اگر باوجود نخالفت کے وہ خدا کا کلام لوگوں کو نہ سُناتا اور سب کا سب کلام نہ سُناتا اور اس کے دشمن تباہ نہ ہوتے اور وہ باوجود دشمنوں کے زور اور ان کی مخالفت کے کامیاب نہ ہوتا اور خدا تعالیٰ اس کے مُنہ میں اپنا کلام نہ ڈالتا تو موسیٰ کی پیشگوئی کس طرح پوری ہوتی اور اس کی سچائی کس طرح ثابت ہوتی پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹ کے الزام سے بچایا اور انکی تصدیق کا موجب ہوئی

تصدیق نمبر ۳

موسیٰ علیہ السلام نے ایک اور پیشگوئی کی تھی کہ "اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہُوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہُوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔"

(استثناء باب ۳۳ آیت ۲) اس پیشگوئی میں تین آسمانی نشانوں کا ذکر ہے ایک سینا سے خدا تعالیٰ کے جلوہ گر ہونے کی جس سے حضرت موسیٰ کی ترقی کی طرف اشارہ ہے دوسرے شعیر سے خدا تعالیٰ کے طلوع کی اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی خبر تھی جو شعیر کے علاقہ میں ظاہر ہوئے۔

تیسرے الٰہی جلوہ کے ظہور کا مقام فاران بتایا گیا ہے اور اس جلوہ کی تفصیل پہلے دونوں جلووں سے زیادہ بیان کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی جلوہ کا ذکر اس جگہ اصل میں مقصود ہے۔ اس جلوہ کا مقام فاران بتایا گیا ہے اور اس جلوہ کے ظہور کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ دس ہزار قدوسیوں کی معیت میں وہ ہوگا۔ اور اسکی مزید خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ جس شخص کے ذریعہ سے وہ جلوہ ظاہر ہوگا اسکے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ہوگی۔ یہ تینوں نشانیاں تمام وکمال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں پائی جاتی ہیں آپ قرآن کریم کی واضح پیشگوئیوں کے مطابق جب کفار مکہ پر غالب آکر مکہ میں داخل ہوئے تو فاران کی طرف سے ہی آپ کا داخلہ ہُوا کیونکہ مدینہ اور مکہ کے درمیان میں فاران کی وادی واقع ہے اور جس وقت آپ مکہ پر حملہ آور ہوئے آپ کے ساتھ دس ہزار صحابہ کا لشکر تھا اور آپ ایک آتشی شریعت دُنیا کے لئے لائے تھے یعنی جو اللہ تعالیٰ کی محبت سے انسان کی بدیوں اور اس کے گناہوں کو جلا دینے والی ہے اور اس لحاظ سے بھی وہ آتشی شریعت ہے کہ اس میں نہ صرف ماننے والوں کے لئے انعامات کے وعدے ہیں بلکہ منکروں اور شریروں کے لئے سزاؤں کا بھی ذکر ہے۔

قرآن اور آنحضرتؐ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک اور پیشگوئی کا تصدیق کرنا۔

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر نہ ہوتے انھیں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہ کرنی پڑتی۔ اور پھر خدا تعالیٰ آپ کو دشمنوں پر غلبہ نہ دیتا آپ کے ہاتھ پر مکہ فتح نہ ہوتا آپ کے ساتھ اس وقت دس ہزار صحابہ نہ ہوتے آپ کے ہاتھ میں ایک کامل شریعت جو صرف مومنوں کے لئے ترقی کی خبر دینے والی نہ تھی بلکہ دشمنانِ حق کی سزاؤں کی خبروں پر بھی مشتمل تھی نہ ہوتی تو استثناء باب ۳۳ آیت ۲ کی پیشگوئی کس طرح پوری ہوتی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی تصدیق کس طرح ہوتی۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اس پیشگوئی کو پورا کرنے اور اسے سچا ثابت کرنے کا موجب ہو کر مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ ثابت ہوئی۔

تصدیق نمبر ۴

تصدیق نمبر ۴ حضرت سلیمان علیہ السلام کے الہام کی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام غزل الغزلات میں فرماتے ہیں "میرا محبوب سُرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں کے درمیان وہ جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے اور اس کا سر ایسا ہے جیسا چوکھا سونا اسکی زلفیں پیچ در پیچ ہیں اور کوّے کی سی کالی ہیں اسکی آنکھیں ان کبوتروں کی مانند ہیں جو لبِ دریا دودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھے ہیں اس کے رخسارے پھولوں کے چمن اور بلسان کی اُبھری ہوئی کیاری کی مانند ہیں اس کے لب سوسن ہیں جن سے بہتا ہُوا مُر ٹپکتا ہے اسکے

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے کلام کی تصدیق کرنا۔

ہاتھ ایسے ہیں جیسے سونے کی کڑیاں جن میں ترسیس کے جواہر جڑے گئے اس کا پیٹ ہاتھی دانت کا سا کام ہے جسپر نیلم کے گل بنے ہوں۔ اس کے پَیر ایسے جیسے سنگ مرمر کے ستون جو سونے کے پایوں پر کھڑے کئے جاویں اس کی قامت لبنان کی سی وہ خوبی میں رشک سرو ہے اس کا مُنہ شیریں ہے ہاں وہ سراپا عشق انگیز ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے" (غزل الغزلات باب۵ آیت ۱۰ تا ۱۶) اس پیشگوئی میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ بتایا ہے جو تاریخ سے سُرخ و سفید ثابت ہے پھر فتح مکہ کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ آپ دس ہزار آدمیوں کے ساتھ فتح مندانہ اپنے ملک کو واپس آئینگے یہ دس ہزار آدمی وہی دس ہزار قدوسی ہیں جن کا ذکر استثناء باب۳۳ کی پیشگوئی میں تصدیق نمبر۳ میں گزر چکا ہے پھر آخر میں آپ کا نام بھی بتا دیا ہے یعنی 'محمدؐ' اس نام کو چھپانے کے لئے بائبل کے مترجموں نے اُردو میں 'عشق انگیز' کے الفاظ لکھدیئے ہیں لیکن عبرانی زبان کے اصل الفاظ جو اس جگہ ہیں اُن کا اُردو ترجمہ یُوں ہے " ہاں وہ محمدیم ہے۔ محمدیم میں یَ اور مَ ادب کیلئے بڑھائے گئے ہیں جیسے الوہ جس کے معنے خدا کے ہیں اسے بائبل میں بہت جگہ الوھیم لکھا جاتا ہے پس ہاں وہ محمدیم کے معنے ہیں ہاں وہ بزرگ محمدؐ ہے چنانچہ اس پیشگوئی کی وجہ سے یہ دیکھتے ہوئے کہ کئی نشانات ظہور محمدؐ کے ظاہر ہو چکے ہیں لوگ اپنے بچوں کے نام محمد رکھنے لگ گئے تھے چنانچہ مدینہ میں بھی کئی ایک شخص کا نام انکے والدین نے محمد رکھے ہوئے تھے چنانچہ ان میں سے ایک محمد بن احیحہ بھی تھے جو صحابہ میں شمار ہوتے ہیں (اسد الغابہ جلد۴)

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یسعیاہ نبی کے کلام کی تصدیق کرنا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے اس پیشگوئی کی بھی تصدیق کی۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا تعالیٰ کا کلام نہ اُترتا تو سلیمان علیہ السلام کی یہ پیشگوئی جھوٹی جاتی۔

تصدیق نمبر ۵

"وہ کس کو دانش سکھاوے گا کس کو وعظ کر کے سمجھاوے گا۔ ان کو جن کا دودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جُدا کئے گئے۔ کیونکہ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون قانون پر قانون ہوتا جاتا۔ تھوڑا یہاں۔ تھوڑا وہاں۔ ہاں وہ وحشی کے سے ہونٹھوں اور اجنبی زبان سے اس گروہ کے ساتھ باتیں کرے گا۔ کہ اس نے اُن سے کہا کہ یہ وہ آرامگاہ ہے تم ان کو جو تھکے ہوئے ہیں آرام دیجیئو اور یہ چین کی حالت ہے پروے شنوا نہ ہوئے سو خدا کا کلام ان سے یہ ہوگا۔ حکم پر حکم۔ حکم پر حکم۔ قانون پر قانون۔ قانون پر قانون۔ تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔ تاکہ وے چلے جاویں۔ اور پچھاڑی گریں اور شکست کھاویں اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوویں (یسعیاہ باب۲۸ آیت ۹ تا ۱۳) اس پیشگوئی سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ایک زمانہ میں (۱) اسی قوم کے پاس آئے گا جو الہام کے دودھ سے محروم کر دی گئی اور جو اپنی والدہ سے جدا کئے گئے یعنی نبوت پانے کے بعد اس سے محروم کر دیئے گئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت آئے جب نبوت پر ایک لمبا عرصہ گزر گیا تھا اور آپ نے بنی اسرائیل کو بھی مخاطب کیا جو الہام کے دودھ سے محروم کر دیئے گئے تھے اور نبوت کی چھاتیوں سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ قرآن کریم میں آتا ہے يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ ع ۳) یعنی اے اہل کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آیا ہے رسولوں کے ناغہ کے بعد وہ تمہارے فائدے کی باتیں بیان کرتا ہے تا یہ نہ کہو کہ ہمارے پاس تو نہ کوئی خوشخبری دینے والا آیا نہ ڈرانے والا پس خوب سُن لو کہ تمہارے پاس اب ایک خوشخبری دینے والا بھی اور ڈرانے والا بھی آگیا ہے۔ اور اللہ ہر امر پر خوب قادر ہے۔ غرض اسی آیت میں یسعیاہ نبی کے ان الفاظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ "وہ کس کو دانش سکھائے گا کس کو وعظ کر کے سمجھائیگا

ان کو جن کا دودھ چھڑایا گیا جو چھاتیوں سے جدا کئے گئے" (۲) دوسرے وہ کلام جو اس قوم کے لئے نازل ہوگا یکدم نازل نہ ہوگا نہ کسی ایک شہر میں نازل ہوگا بلکہ حکم پر حکم اور قانون پر قانون مختلف مقامات پر اُتریںگے۔ قرآن کریم اسی طرح اُترا کچھ مکہ میں کچھ مدینہ میں کچھ سفروں میں حتّٰی کہ دشمنوں نے اعتراض کیا کہ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (فرقان ع ۳) یعنی کیوں محمدؐ پر سارا قرآن ایک ہی دفعہ نہ اُترا۔ اور باوجود یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مسیحی لوگ آج تک قرآن کریم پر یہ اعتراض کرتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح اپنی قلموں سے اس امر کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مصداق تھے (۳) تیسرے وہ کلام ایک عرب کی زبان سے سُنایا جائے گا اور غیر زبان یعنی عربی زبان میں سُنایا جائے گا کیونکہ وحشی کا لفظ عرب پر دلالت کرتا ہے اوپر پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲ کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس میں حضرت ہاجرہ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تھی اس میں لکھا تھا " وہ (یعنی اسماعیل) وحشی آدمی ہوگا۔ پس وحشی حضرت اسماعیل کا نام ہے جو بائبل میں آتا ہے اور درحقیقت عرب کا ترجمہ ہے جو تعصب کی وجہ سے بنو اسرائیل نے وحشی کے لفظ سے کیا ہے ع ر ب کے معنے عربی زبان میں اظہار کے ہوتے ہیں اور عرب عربوں کا نام اسی لئے ہے کہ وہ خیموں میں رہتے تھے ادب کے دلدادہ تھے اور نہایت فصیح بلیغ کلام کرنے تھے خیموں اور بادیہ میں رہنے کی وجہ سے ان کے مخالف بجائے خیموں میں رہنے والوں کے انہیں وحشی کہتے تھے بائبل نے بھی یہی طریق اختیار کیا اور جہاں حضرت اسماعیل کا ذکر آیا وہاں بھی انہیں وحشی کے لفظ سے یاد کیا ہے اور جہاں ان کی اولاد میں سے آنے والے نبی کا ذکر آیا وہاں بھی بجائے یوں کہنے کے کہ وہ اسماعیل کی اولاد میں سے ہوگا یہ لکھ دیا کہ وہ وحشی کے ہونٹوں سے کلام کرے گا گو قرآن کریم عربی زبان میں ہے اور ہر اک کو نظر آتا ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم فرماتا ہے وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (احقاف ع ۲) یعنی اس قرآن سے پہلے موسٰی کی کتاب گذر چکی ہے یہ قرآن اسکی پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا ہے چنانچہ انہی پیشگوئیوں کے مطابق یہ عربی زبان میں اُترا ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور محسنوں کو بشارت دے اس جگہ قرآن کریم کا عربی زبان میں ہونا موسوی کتب کی تصدیق کا موجب قرار دیا ہے اس سے اشارہ کتاب پیدائش کی اس پیشگوئی کی طرف ہے جس میں حضرت اسماعیل کو وحشی یعنی عرب قرار دیا گیا ہے اور دوسرے استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ کی اس پیشگوئی کی طرف جس میں کہا گیا تھا کہ آیندہ شریعت والا کلام بنو اسحاق میں سے کسی فرد پر نہیں بلکہ ان کے بھائی بنو اسماعیل پر اُتارا جائے گا اور ضمناً حضرت یسعیاہ کی پیشگوئی کی طرف بھی اشارہ ہوگیا جو حضرت موسٰی کے تابع نبی تھے اور جنکی مذکورہ بالا پیشگوئی حضرت موسٰی علیہ السلام کی کتاب میں بیان شدہ پیشگوئی کی مزید وضاحت تھی (۴) چوتھے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ نبی یہود سے کہے گا کہ اس کا جائے رہائش آرامگاہ یعنی امن کا مقام ہے پس تم اُن کو جو تھکے ہوئے ہیں آرام دیجیو۔ اس طرح تم چین سے رہو گے مگر یہود نبی کی اس بات کو نہ مانیںگے اور اس جگہ کو آرامگاہ نہ بننے دینگے اور تھکے ہوؤں کو تکلیف دیں گے یہ امر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ پر صادق آتا ہے آپؐ نے مدینہ منورہ کو جہاں یہود بھی رہتے تھے مکہ مکرمہ کی طرح امن کی جگہ قرار دیا اور یہود سے مدینہ منورہ کو باامن رکھنے کے لئے معاہدہ کیا (سیرت حلبیہ جلد ۲) لیکن اُنھوں نے تھکے ہوؤں کو یعنی مہاجرین کو جو دُور سے سفر کر کے آئے

تھے آرام سے نہ رہنے دیا اور مطابق پیشگوئی خود بھی چین نہ پایا (۵) پانچویں اس پیشگوئی میں تھا۔ حکم پر حکم نازل ہوگا" تاکہ وے چلے جاویں اور پچھاڑی گریں اور شکست کھاویں اور دام میں پھنسیں اور گرفتار ہوویں۔" یہ پیشگوئی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں پوری ہوئی۔ یہود نے جب تھکے ہوؤں کو آرام میں نہ رہنے دیا تو وہ "چلے بھی گئے" یعنی کچھ ان میں سے مدینہ سے جلاوطن کئے گئے وہ "پچھاڑی بھی گرے" یعنی بعض قتل بھی کئے گئے انہوں نے شکست بھی کھائی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور دام میں پھنسے اور گرفتار بھی ہوئے بعض ان میں سے غلام بھی بنائے گئے۔

قرآن مجید کا حضرت داؤد اور حضرت دانیال کے کلام کی تصدیق کرنا

یہ کیسی واضح پیشگوئی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پوری ہوئی اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ نازل نہ ہوتی اور یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کی اس طرح تصدیق نہ ہوتی تو یسعیاہ جھوٹے قرار پاتے لیکن قرآن کریم کے ذریعہ سے ان کی پیشگوئی پوری ہو کر ان کے کلام کی تصدیق ہوگئی۔

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یسعیاہ نبی کے ایک اور کلام کی تصدیق کرنا۔

تصدیق نمبر ۶ یہی یسعیاہ نبی فرماتے ہیں" باوجود اس کے خداوند یہوواہ یوں فرماتا ہے دیکھو میں صیحون میں بنیاد کے لئے ایک پتھر رکھونگا ایک آزمایا ہؤا پتھر کونے کے سرے کا ایک مہنگ مولا ایک مضبوط نیو والا پتھر اسپر جو ایمان لاوے اتاولی نہ کرے گا" (یسعیاہ باب ۲۸ آیت ۱۶) حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں" وہ پتھر جسے معماروں نے رد کیا کونے کا سرا ہوگیا ہے یہ خداوند سے ہؤا جو ہماری نظروں میں عجیب ہے" (زبور ۱۱۸۔ آیت ۲۲ و ۲۳) پھر فرماتے ہیں" مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے ہم خداوند کے گھر میں سے تم کو مبارک باد دیتے ہیں" (آیت ۲۶) پھر اسی بارہ میں دانیال علیہ السلام پر الہام نازل ہؤا اس کا قصہ یوں ہے کہ بنوکد نضر بادشاہ نے ایک خواب دیکھا جسے وہ بھول گیا اس نے اپنے منجموں سے اس کا حال پوچھا مگر انہوں نے بھولی ہوئی خواب کی تعبیر بتانے سے معذوری ظاہر کی اسپر بادشاہ نے ان کے قتل کا حکم دیا دانیال نبی جو یروشلم سے لائے ہوئے قیدیوں میں سے تھے انہوں نے یہ حال سُنا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اس نے ان کو خواب اور اسکی تعبیر بتادی اسپر انہوں نے بادشاہ سے خواب اور اسکی تعبیر بتانے پر آمادگی ظاہر کی اور مندرجہ ذیل الفاظ میں خواب اور اسکی تعبیر بتائی" تُو نے اے بادشاہ نظر کی تھی اور دیکھ ایک بڑی مورت تھی وہ بڑی مورت جسکی رونق بے نہایت تھی تیرے سامنے کھڑی ہوئی اور اسکی صورت ہیبت ناک تھی اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کا۔ اس کا شکم اور رانیں تانبے کی تھیں اس کی ٹانگیں لوہے کی۔ اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے تھے اور تُو اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایک پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کے نکالے آپ سے نکلا جو اس شکل کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ تب لوہا اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور تابستانی کھلیان کی بھوسی کے مانند ہوئے اور ہَوا انہیں اُڑا لے گئی یہاں تک کہ ان کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین کو بھر دیا وہ خواب یہ ہے اور اس کی تعبیر بادشاہ کے حضور بیان کرتا ہوں تو اے بادشاہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس لئے کہ آسمان کے خدا نے تجھے ایک بادشاہت اور توانائی اور قوت اور شوکت بخشی ہے اور جہاں کہیں بنی آدم سکونت کرتے ہیں اس نے میدان کے چوپائے اور ہَوا کے پرندے تیرے قابو میں کر دیئے اور تجھے ان سبھوں کا حاکم کیا۔ تو ہی وہ سونے کا سر ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی اور اس کے بعد

ایک اور سلطنت تانبے کی جو تمام زمین پر حکومت کریگی اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی اور جس طرح کہ لوہا توڑ ڈالتا ہے اور سب چیزوں پر غالب ہوتا ہے ہاں لوہے کی طرح سے جو سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اسی طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کچل ڈالے گی اور جو کہ تُو نے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کمہار کی ماٹی کی۔ اور کچھ لوہے کی تھیں سو اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا۔ مگر جیسا کہ تو نے دیکھا کہ اس میں لوہا گلاوے سے ملا ہوا تھا۔ سو لوہے کی توانائی اس میں ہوگی اور جیسا کہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ ماٹی کی تھیں۔ سو وہ سلطنت کچھ قوی کچھ ضعیف ہوگی اور جیسا تُو نے دیکھا کہ لوہا گلاوے سے ملا ہُوا ہے وے اپنے آپکو انسان کی نسل سے ملا دینگے لیکن جیسا لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسا وے باہم میل نہ کھا دینگے اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کریگا جو تا ابد نیست نہ ہوویگی اور وہ سلطنت دوسری قوم کے قبضے میں نہ پڑے گی ان سب مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی اور وہی تا ابد قائم رہے گی جیسا کہ تُو نے دیکھا کہ وہ پتھر بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے اس کو پہاڑ سے کاٹ نکالے آپ سے آپ نکلا اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا خدا تعالےٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھایا جو آگے کو ہونے والا ہے اور یہ خواب یقینی ہے اور اسکی تعبیر یقینی" (دانیال باب ۲ آیت ۳۱ تا ۴۵) ان تین انبیاءؑ کی بتائی ہوئی خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک روحانی بادشاہ کا ظہور ہونے والا تھا جس نے کوئے کے پتھر کی حیثیت پائی تھی یعنی وہ روحانی سلسلہ کا آخری وجود ہونے والا تھا۔ وہ پتھر بڑا قیمتی ہوگا مضبوط نیو والا۔ جو اس پر ایمان لائینگے صاحب وقار ہونگے اور جلد باز نہ ہوں گے وہ پتھر ایسا ہوگا جسے معماروں نے رد کیا ہوا ہوگا وہ زبردست بادشاہوں کو کچل ڈالے گا وہ ان گھڑ پتھر ہوگا اور کسی انسان کے ہاتھ نے اسے نہ گھڑا ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس پیشگوئی کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"ایک اور تمثیل سنو۔ ایک گھر کا مالک تھا جس نے انگورستان لگایا اور اس کی چاروں طرف روندھا اور اس کے بیچ میں کھود کے کولہو گاڑا اور بُرج بنایا اور باغبانوں کو سونپ کے آپ پردیس گیا اور جب میوہ کا موسم قریب آیا اس نے اپنے نوکروں کو باغبانوں پاس بھیجا کہ اس کا پھل لاویں پر ان باغبانوں نے اس کے نوکروں کو پکڑ کے ایک کو پیٹا اور ایک کو مار ڈالا اور ایک کو پتھراؤ کیا۔ پھر اس نے اور نوکروں کو جو پہلوں سے بڑھ کر تھے بھیجا انہوں نے ان کے ساتھ بھی ویسا ہی کیا آخر اس نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس یہ کہکر بھیجا کہ وے میرے بیٹے سے دبیں گے لیکن جب باغبانوں نے بیٹے کو دیکھا آپس میں کہنے لگے وارث یہی ہے آؤ اسے مار ڈالیں کہ اس کی میراث ہماری ہو جائے اور اسے پکڑ کے اور انگورستان کے باہر لے جا کر قتل کیا جب انگورستان کا مالک آوے گا تو ان باغبانوں کے ساتھ کیا کریگا وے اسے بولے ان بدوں کو بُری طرح مار ڈالے گا اور انگورستان کو اور باغبانوں کو سونپے گا جو اسے موسم پر میوہ پہنچاویں یسوع نے انہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہُوا یہ خداوند کی طرف سے ہے اور ہماری نظروں میں عجیب اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائیگی" (متی باب ۲۱ آیت ۳۳ تا ۴۳) اس حوالہ میں حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک تمثیل دی ہے اور بتایا ہے کہ بنی اسرائیل نے بہت سے نبیوں کا انکار کیا آخر خدا تعالےٰ نے ایک ایسے نبی کو بھیجا جو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا یعنی خود مسیح علیہ السلام لیکن بنی اسرائیل ان کا بھی انکار کریں گے اور انہیں قتل کریں گے یعنی قتل کرنے کی کوشش کرینگے جیسا کہ دوسرے

قرآن مجید اور آنحضرتؐ کا حضرت مسیح کے کام کی تصدیق کرنا۔

حوالوں سے جو اپنے وقت پر بیان ہونگے ثابت ہے) اسپر ایک ایسا نبی آئے گا جو خدا تعالیٰ کا ظہور کہلائے گا اور وہ کونے کا پتھر ہوگا اسکی آمد پر بنی اسرائیل کو مکمل سزا دی جائے گی اور خدا تعالےٰ کی بادشاہت ایک ایسی قوم کے سپرد کی جائے گی جو خدا تعالےٰ کو وقت پر میوہ پہنچائیں گے یعنی خدا تعالیٰ کے احکام کو پوری طرح بجا لائیں گے وہ پتھر اس شان کا ہوگا کہ جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا اور جو اس پر گرے گا وہ بھی چور چور ہوگا۔

آنحضرتؐ کا اپنے آپ کو کونے کا پتھر کہنا۔

یہ پیشگوئیاں جن کے بیان کرنے میں چار نبیوں نے حصہ لیا ہے یعنی داؤدؑ۔ یسعیاہؑ و دانیالؑ اور حضرت مسیحؑ ایسی واضح طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری ہوتی ہیں کہ سوائے تعصب سے اندھے شخص کے کوئی ان کا انکار نہیں کرسکتا آپ بنو اسماعیل میں سے تھے جن کو بنو اسحاق نے ہمیشہ رد کیا اور ابراہیم کی برکتوں سے ہمیشہ محروم رکھنے کی کوشش کیں آپ نے خود دعویٰ فرمایا کہ میں کونے کا پتھر ہوں چنانچہ آپ فرماتے ہیں مَثَلِیْ وَمَثَلُ الْاَنْبِیَآءِ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بُنْیَانًا فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ فَجَعَلَ النَّاسُ یُطِیْفُوْنَ بِهٖ یَقُوْلُوْنَ مَا رَاَیْنَا بُنْیَانًا اَحْسَنَ مِنْ هٰذَا اِلَّا هٰذِهِ اللَّبِنَةَ فَکُنْتُ اَنَا تِلْکَ اللَّبِنَةَ (مسلم جلد ۴ کتاب الفضائل) یعنی میرا اور دوسرے انبیاء کا حال یوں ہے کہ جیسے کسی نے ایک عمدہ اور خوبصورت محل تیار کیا پھر لوگ کثرت سے اسے دیکھنے کے لئے آنے لگے اور کہتے تھے کہ ہم نے اس سے عمدہ محل کوئی نہیں دیکھا ہاں یہ کونہ اس کا ننگا ہے پھر خدا تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا اور میں وہ کونے کا پتھر ہوں۔ آپؐ کا وجود نہایت قیمتی وجود تھا اور آپکی بنیاد مضبوط جیسا کہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ باوجود دنیا کی شدید مخالفت کے تیرہ سو سال سے آپؐ کے مقام کو کوئی نہیں ہلا سکا۔ آپؐ کے صحابہ مسیح کے حواریوں کی طرح جلد بازی کرنے والے نہ تھے بلکہ نہایت صاحب وقار تھے مسیح کے حواریوں کا تو یہ حال

کونے کا پتھر یعنی آنحضرتؐ کی شان

تھا کہ جب مسیحؑ کو رومی سلطنت نے پکڑا تو وہ ان کا انکار کر بیٹھے اور تتر بتر ہو گئے (متی باب ۲۶ آیت ۵۶۔۷۰۔۷۴) مگر آپؐ کے صحابہ نے خطرناک مواقع پر کہا کہ یا رسول اللہ ہم آپکے دائیں بھی لڑینگے بائیں بھی اور آگے بھی لڑینگے پیچھے بھی اور دشمن آپؐ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے قرآن کریم انکی شان میں فرماتا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان ع ۶) یعنی محمد رسول اللہ پر ایمان لانے والے اللہ کے بندے ایسے ہیں کہ زمین پر بڑے اطمینان سے چلتے ہیں اور جلد بازی سے کام نہیں لیتے اور جب جاہل لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں تو وہ غصہ میں آکر گالیاں نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری سلامتی چاہتے ہیں پھر فرماتا ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا (فرقان ع) یعنی جب وہ لہو و لعب کے امور کے مواقع کے پاس سے گزرتے ہیں تو دنیوی لذات سے متاثر ہو کر ان میں شامل نہیں ہو جاتے جیسے کہ مسیح کی اُمت ہے کہ ذکر الٰہی کو بھول کر ناچ گانے اور موسیقی میں مشغول ہو گئی ہے بلکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہوئے اُخروی زندگی کی طرف جس کے پھل دیر سے ملتے ہیں آگے بڑھ جاتے ہیں۔

پھر اس کونے کے پتھر کی شان یہ بتائی تھی کہ اس کا آنا خدا تعالیٰ کا آنا کہلائے گا اور وہ خدا تعالیٰ کے نام پر آئے گا۔ مسیح علیہ السلام نے اسکی مزید تشریح یہ کر دی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کے نام پر آنے والا خدا کا بیٹا کہلانے والے کے بعد آئے گا چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تشریف لائے اور آپ کا آنا خدا کا آنا کہلایا۔ چنانچہ آپؐ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح ع) یعنی وہ لوگ جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں تیرا ہاتھ

ان کے ہاتھوں پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالےٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔

ان الفاظ میں کہ آپ کا آنا خدا کا آنا ہے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ مثیل موسیٰ ہونگے کیونکہ حضرت موسیٰ کی نسبت آتا ہے کہ وہ خدا کی مانند تھا۔ چنانچہ خروج باب ۷ آیت ۱ میں ہے کہ " پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ دیکھ مَیں نے تجھے فرعون کے لئے خدا سا بنایا " پس خدا کے مانند ہونے کے معنے دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ وہ مثیل موسیٰ ہوگا اور اس طرح گویا استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ کی پیشگوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر اس پیشگوئی میں ہے کہ وہ پتھر جس پر گرے گا اسے پیس ڈالے گا اور جو اس پر گرے گا چُور چُور ہوگا سو ایسا ہی آپ سے ہُوا۔ باوجود انتہائی غربت اور کمزوری کے ساری قوموں سے آپ کی لڑائی ہوئی اور آپ کامیاب رہے حضرت مسیح علیہ السلام نے تو آپ کی جنگوں کا نقشہ ہی کھینچ دیا ہے یعنی فرماتے ہیں " جو اس پتھر پر گرے گا وہ چور ہو جائے گا پر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا " یعنی اس کی جنگوں کی یہ کیفیت ہوگی کہ پہلے دشمن اس پر حملہ کرے گا اور سخت نقصان اٹھاتا رہے گا بعد میں وہ دشمن پر حملہ کرے گا اور اسے تباہ کر دے گا اسی طرح آپ سے ہُوا کہ پہلے آپ کے دشمن آپ پر حملہ کرتے رہے اور چُور ہوتے رہے بعد میں آپ نے حملہ کیا اور ان کی شوکت کو بالکل توڑ دیا۔ دانیال نبی نے یہ خبر بھی دی تھی کہ اسکی جنگ اپنی ہی قوم سے نہ ہوگی بلکہ اس کے زمانہ کی زبردست حکومتوں سے بھی ہوگی اور وہ بھی اس کے ہاتھوں تباہ ہونگی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں آپ کی پیشگوئی کے مطابق قیصر کی حکومت تباہ ہوئی دانیال نبی نے اس حکومت کے مذہب کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے فرماتے ہیں " اور جیسا تُو نے دیکھا کہ لوہا گلاوے سے مِلا ہُوا ہے وے اپنے کو انسان کی نسل سے ملاویں گے لیکن جیسے لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا ویسا وے باہم میل نہ کھائیں گے " (دانیال باب ۲ آیت ۴۳)

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قوم ایک ایسے مذہب سے وابستہ ہوگی جس میں داخل ہونے کا اسے حق نہ ہوگا کیونکہ یہ فرمایا کہ وہ قوم اپنے آپ کو انسان کی نسل سے ملاویگی۔ اس سے یہ مُراد تو نہیں ہو سکتی کہ وہ انسان نہ ہونگے کیونکہ انسان ہونا تو ان کا ظاہر ہے پس اس کے کوئی معنے کرنے پڑینگے اور وہ معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ابن آدم سے ملانیکی کوشش کرینگے یعنی مسیح علیہ السلام سے لیکن ان کا یہ دعویٰ باطل ہوگا کیونکہ ابن آدم یعنی مسیح تو صرف بنی اسرائیل کے لئے آئے گا غیر قوموں کو اس کے مذہب میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ ہوگی جیسے کہ خود مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں " میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی پاس نہیں بھیجا گیا " (متی باب ۱۵ آیت ۲۴) اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے جب اپنے بعض حواریوں کو مبلّغ بنا کر بھجوایا تو انہیں مندرجۂ ذیل الفاظ میں حکم دیا۔ " غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا " (متی باب ۱۰ آیت ۵)

حضرت مسیح علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگوں کا نقشہ کھینچنا۔

پس رومی لوگ جو اپنے آپ کو مسیحی کہتے تھے ان کی مثال ایسے وجود کی تھی جو اپنے آپ کو ایسی نسل میں شامل کرتا ہے جس میں وہ شامل ہونے کا حق نہیں رکھتا اور یہ جو کہا ہے کہ انسان سے مراد مسیح ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا نام بار بار انجیل میں ابن آدم آتا ہے چنانچہ متی باب ۲۴ آیت ۲۷ میں لکھا ہے " جیسے بجلی پورب سے کوندھ کے پچھم تک چمکتی ویسا ہی ابن آدم کا آنا بھی ہوگا " پس انسان سے مراد اس جگہ ابن آدم کے ساتھ اپنے آپ کو منسوب کرنا ہے۔

آن گھڑ پتھر سے مراد آنحضرت کا امی ہونا

پھر لکھا تھا کہ وہ ان گھڑ پتھر ہوگا اس سے مراد یہ تھی کہ وہ پڑھا لکھا نہ ہوگا اور انسانوں نے اسے تعلیم نہ دی ہوگی چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اور قرآن کریم نے اس پیشگوئی کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (اعراف ۱۹)

یعنی وہ لوگ جو اتباع کرتے ہیں اس رسول نبی اور اُمّی کی جس کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے اس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ تورات اور انجیل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تین ناموں سے کیا گیا ہے۔ رسول کے نام سے نبی کے نام سے۔ اور اُمّی یعنی اَن پڑھ کے نام سے اور جیسا کہ اوپر کے حوالجات میں بتایا گیا ہے عہد نامہ قدیم میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اَن گھڑے پتھر کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور انجیل نے اس پیشگوئی کی تصدیق کی ہے اور گویا عربی زبان کے محاورہ کے مطابق آپ کے اُمّی ہونے کی خبر دی ہے۔

اَن پڑھ ہونے کی پیشگوئی حضرت مسیح پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ اس پیشگوئی کو نادانی سے مسیح ناصری پر چسپاں کرتے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ مسیح ان پڑھ نہ تھا اس کے انسان اُستاد تھے چنانچہ لکھا ہے "تب یسوع جلیل سے یردن کے کنارے یوحنا کے پاس آیا تاکہ اس سے بپتسمہ پاوے" (متی باب ۳ آیت ۱۳) پھر لکھا ہے " اور یسوع بپتسمہ پاکے وہیں پانی سے نکل کے اوپر آیا" (آیت ۱۶) پس مسیح نے نہ صرف مادی تعلیم پائی بلکہ رُوحانی تعلیم کے لئے بھی وہ یحییٰ کا شاگرد ہُوا پس وہ اُمّی نہیں کہلا سکتا اور اس پیشگوئی کے مصداق کے لئے اُمّی ہونے کی شرط ہے نیز مسیح میں یہ بات بھی پائی نہیں جاتی کہ جو اس پر گرے چُور چُور ہو جائے اور جس پر وہ گرے اسے نیست کر دے لوگ مسیح پر گرے اور اسے ایذا دی اور اسے کسی پر گرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔

اب اگر یہ پیشگوئیاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے پوری نہ ہوتیں تو داؤد۔ یسعیاہ۔ دانیال۔ اور مسیح علیہ السلام سب کے سب نعوذ باللہ من ذالک جھوٹے قرار پاتے۔ پس ان پیشگوئیوں کو پورا کر کے قرآن کریم نے ان انبیاء کے کلام کی تصدیق کی ہے۔

قرآن مجید اور آنحضرتؐ کا مسیح کے حواریوں کے اقوال کی تصدیق کرنا۔

تصدیق نمبر ۷

کتاب اعمال میں لکھا ہے " پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے تازگی بخش ایام آویں اور یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی ضرور ہے کہ آسمان اسے لئے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اُٹھاوےگا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس جو اس نبی کی نہ سنے وہ قوم میں سے نیست کیا جائے گا بلکہ سب نبیوں نے سموایل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دنوں کی خبر دی ہے تم نبیوں کی اولاد اور اس عہد کے ہو جو خدا نے باپ دادوں سے باندھا ہے جب ابراہام سے کہا کہ تیری اولاد سے دُنیا کے سارے گھرانے برکت پاویں گے تمہارے پاس خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو اُٹھا کے پہلے بھیجا کہ تم میں سے ہر ایک کو اس کی بدیوں سے پھیر کے برکت دے" (اعمال باب ۳ آیت ۱۹ تا ۲۶) یہ پیشگوئی اعمال میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ پیشگوئی بہر حال حضرت مسیح علیہ السلام سے نقل ہوگی کیونکہ حواری انہی کے اقوال کو نقل کرتے ہیں اور مسیحیوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ حواری جو کچھ کہتے تھے مسیح کے روحانی اثر کے نیچے کہتے تھے اسی وجہ سے حواریوں کے اعمال و اقوال کو انہوں نے الہامی نوشتوں میں جگہ دی ہے اور بائبل کا حصہ قرار دیا ہے علاوہ ازیں جیسا کہ تصدیق نمبر ۶ میں بیان کیا جا چکا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے دوسرے لفظوں میں اس پیشگوئی کو بیان کیا ہے پس جو کچھ اعمال کے حوالہ میں کہا گیا ہے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا کہا ہُوا ہے۔

اس حوالہ میں مندرجہ ذیل امور بیان ہوئے ہیں (۱) مسیح علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں نازل نہ ہونگے جب تک کہ وہ پیشگوئی موسیٰ کی پوری نہ ہولے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی موسیٰ کی مانند آئے گا (۲) موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ سموایل سے لے کر آخر تک سب نبیوں نے اس

آنے والے کی خبر دی ہے (۳) مسیح اوّل کی آمد اس نبی کے لئے بشارت دینے والے کی تھی کیونکہ لکھا ہے تمہارے پاس خدا نے اپنے بیٹے یسوع کو اُٹھا کے پہلے بھیجا کہ تم کو اپنی بدیوں سے پھیر کے برکت دے۔

مَیں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ موسیٰ کی مانند نبی یا انجیل کے محاورہ کے مطابق وہ نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے پس اس پیشگوئی میں جو کہا گیا ہے کہ ضروری ہے کہ مسیح آسمان پر ہی رہے جب تک سب پیشگوئیاں خصوصاً مثیل موسیٰ کے آنے کی پیشگوئی پوری نہ ہو جائے۔ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی گئی تھی نیز یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حضرت مسیح کی پہلی آمد اس لئے تھی کہ تا وہ اس نبی کے لئے راستہ صاف کریں اور لوگوں کے دلوں کو گناہوں سے صاف کردیں تا وہ اس پر ایمان لائیں کیونکہ لکھا ہے خدا نے یسوع کو اُٹھا کے پہلے بھیجا۔ یہ الفاظ صاف بتلاتے ہیں کہ مسیح کی آمد بطور ایک مبشر کے تھی اور غرض یہ تھی کہ کچھ لوگوں کے دل صاف ہو جائیں اور یہودیت کی سختی ان کے دلوں پر سے جاتی رہے اور ایسا ہی ہُوا۔ قرآن کریم فرماتا ہے لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ (مائدہ ع۱۱) یعنے مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تو یہود کو پائے گا اسی طرح مشرک لوگوں کو۔ اور مسلمانوں سے محبت کرنے میں سب سے زیادہ قریب تو ان لوگوں کو پائے گا جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں یہ اس لئے ہے کہ ان میں پادریوں اور زاہدوں کا گروہ پایا جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ ان میں فروتنی پائی جاتی ہے اور جب وہ اس کلام کو جو ہمارے اس رسول پر نازل ہُوا ہے سُنتے ہیں تو اس وجہ سے کہ انہوں نے سچ کو پہچان لیا ہے تجھے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ کہتے ہیں اے رب ہم ایمان لے آئے ہمارا نام بھی گواہوں میں لکھ لے۔

غرض قرآن کریم بھی مسیح کی اس پیشگوئی کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح نے پہلے آکر بہتوں کے دلوں کو گناہوں سے پھیر دیا اور انہیں برکت دی حتّٰی کہ وہ اس نبی کو جو موسیٰ کی مانند تھا ماننے کے قابل ہو گئے۔

اوپر کی پیشگوئی کو پورا کرکے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح اور سموایل سے لے کر آخر تک کے سب نبیوں کی تصدیق کی۔ اگر آپ نہ آتے تو یہ سب کے سب جھوٹے ٹھہرتے۔

پیشگوئیاں تو بہت ہیں جن کو پورا کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے انبیاء کے کلام کی تصدیق کی ہے مگر میں اس موقعہ پر اس پر بس کرتا ہوں انہی مثالوں سے ہر غیر متعصب اس امر کو سمجھ سکے گا کہ قرآن کریم کا بنی اسرائیل سے یہ کہنا کہ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ کیسا سچا دعویٰ ہے قرآن کریم بنی اسرائیل کی کتب کی خبروں کو پورا کرنے والا ہے۔ بنی اسرائیل میں سے جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کرتا وہ اپنی کتب کا انکار کرتا ہے جنہوں نے اس کے ظہور کی خبر دی تھی۔

قرآن کریم کے مصدق ہونے پر عیسائیوں کا اعتراض اور اس کا جواب۔

بعض مسیحی مصنف اس آیت کی نسبت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قرآن کریم نے اس آیت میں یہ اعلان کیا ہے کہ جو کچھ تمہاری موجودہ کتب میں لکھا ہے وہ سب سچ ہے اور یہ معنے کرکے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ جبکہ قرآن کریم کے نزدیک موجودہ بائبل درست ہے تو پھر قرآن کریم جھوٹا ہُوا کیونکہ وہ موجودہ بائبل کے خلاف مضامین بیان کرتا ہے میری سمجھ میں یہ ذہنیت کبھی بھی نہیں آتی کہ چونکہ الف باء

کو سچا کہتا ہے اس لئے وہ جھوٹا ہے یہ تو گویا احسان کا بدلہ ظلم سے دیتا ہے مگر جیسا کہ میں اوپر بتا آیا ہوں۔ اس آیت کے وہ معنے ہیں ہی نہیں جو یہ پادری صاحب کرتے ہیں انہیں تصدیق کے لفظ سے دھوکا لگا ہے حالانکہ تصدیق کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے کسی کو سچا کہنے کے معنوں میں بھی اور اسکی بات کو پورا کرنے کے معنوں میں بھی۔ اور یہاں وہ دوسرے معنے ہیں قرآن کریم دوسری جگہ فرماتا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (آل عمران ع ۹) یعنی جب اللہ تعالےٰ نے تمام انبیاء سے یہ فرماتے ہوئے پختہ عہد لیا کہ میرے تم کو کتاب اور حکمت دینے کے بعد جو ایسا رسول آئے کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اس کا مصدق ہو تو تم اسپر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا پھر فرمایا کہ کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس بارہ میں مجھ سے پختہ عہد باندھتے ہو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں اسپر فرمایا کہ اب تم بھی گواہ رہو اور میں بھی تمہارا گواہ رہونگا اور یہ بھی یاد رکھو کہ اب اس عہد کے بعد جو لوگ اس سے پھر جائینگے وہ فاسقوں میں سے گنے جائینگے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک تمام انبیاء کو ایک ایسے نبی کے آنے کی خبر دی گئی تھی جو سب انبیاء کی کتب کی تصدیق کرے گا اور اسپر ایمان لانا سب قوموں کے لئے ضروری ہوگا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نبیوں کے متعلق فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر ع ۳) کوئی قوم ایسی نہیں گزری کہ اس میں نبی نہ آیا ہو پھر اس کے بعد فرماتا ہے وَالَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌ

تصدیق کے دو معنے کسی کو سچا کہنے اور کسی کی بات کو پورا کرنے کے۔

بَصِيْرٌ ۝ (فاطر ع ۴) یعنی جو کتاب اللہ تعالیٰ نے تجھ پر وحی سے نازل کی ہے وہ ساری کی ساری حق ہے اور اس سے پہلے جس قدر وحیاں نازل ہو چکی ہیں سب کی مصدق ہے اور اللہ تعالےٰ یقیناً اپنے بندوں سے خبردار اور ان کے حال کا دیکھنے والا ہے ان آیات کو پہلی آیت کے ساتھ ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی سب دُنیا میں اور ہر قوم میں آئے ہیں اور یہ کہ اس آیت کا موعود نبی ہر نبی کی کتاب کا مصدق ہوگا اور ہر نبی کی امت کو اسپر ایمان لانا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس قسم کی تصدیق قرآن کریم بائبل کی کرتا ہے ویسی ہی تصدیق وہ ویدوں کی بھی کرتا ہے اور ویسی ہی تصدیق وہ ژند کی بھی کرتا ہے اور ویسی ہی ان تمام نبیوں کی کتب کی جو دُنیا کے کسی گوشہ میں گذرے ہوں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان سب کتب کی موجودہ شکلوں میں شدید اختلاف ہے اگر انہیں موجودہ شکل میں درست قرار دیا جائے تو چونکہ وہ ایک دوسرے کی مکذب ہیں مذہب کا کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ اور ہم انہیں موجودہ شکل میں خدا تعالےٰ کی کتاب کہہ کر گویا خود ان نبیوں کی تکذیب کرتے ہیں جنکی طرف وہ منسوب ہیں مثلاً کیا ہم موجودہ تورات کو کلی طور پر موسیٰ کا الہام کہہ سکتے ہیں اس میں تو یہ لکھا ہے "سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مر گیا اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پر آج کے دن تک کوئی اسکی قبر کو نہیں جانتا" (استثناء باب ۳۴ آیت ۵ و ۶) پھر لکھا ہے "اور نون کا بیٹا یشوع دانائی کی روح سے معمور ہوا کیونکہ موسیٰ نے اپنے ہاتھ اسپر رکھے تھے اور بنی اسرائیل اس کے مشنوا ہوئے اور جیسا خداوند نے موسیٰ کو فرمایا تھا انہوں نے ویسا ہی کیا۔ اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا" (استثناء باب ۳۴ آیت ۹ و ۱۰) ان آیات سے ظاہر ہے کہ یہ موسیٰ کی وفات کے لمبے عرصہ بعد لکھی گئی ہیں بلکہ اس وقت جبکہ موسیٰ کی قبر کا نشان تک مٹ گیا تھا اور بہت سے نبی بنی اسرائیل میں آ چکے تھے کیونکہ لکھا ہے اب تک

موسٰی کی مانند نبی بنی اسرائیل میں کوئی نہیں آیا۔ کیا کوئی عقلمند مان سکتا ہے کہ حضرت موسٰی اپنی وفات کے سینکڑوں سال بعد دوبارہ دُنیا میں آئے تھے اور یہ الفاظ اپنی کتاب میں بڑھا گئے تھے اگر ایسا نہیں بلکہ کسی اور ہاتھ نے صدیوں بعد موسٰیؑ کی کتاب کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے تھے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اور کیا کیا اس کتاب میں نہ بڑھا دیا ہو گا پھر قرآن کریم کی تصدیق ہم کس کس آیت پر چسپاں کریں اور کیونکر معلوم کریں کہ اس محرّف کتاب میں کہ جسے آج بائبل کے اپنے علماء بھی بہت سے ہاتھوں اور بہت سے زمانوں کا لکھا ہُوا بتاتے ہیں کونسا کلام خدا کا ہے جسکی ہم تصدیق کریں۔ اور کونسا انسانوں کا ہے کہ جسے ہم ردّ کرنے کے مجاز ہوں۔

اسی طرح انجیل میں لکھا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے کہا کہ "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان میں سے جو یہاں کھڑے ہیں بعضے ہیں کہ جب تک ابن آدم کو اپنی بادشاہت میں آتے دیکھ نہ لیں موت کا مزہ نہ چکھیں گے" (متی باب ۱۶ آیت ۲۸) لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ سب لوگ مر گئے اور اس وقت تک انکی سو سو پشت مر چکی ہے مگر مسیحیوں کے نزدیک ابھی تک ابن آدم اپنی بادشاہت میں نہیں آیا اگر مسیح کی آمد سے اس کی قوم کی ترقی مراد لی جائے تب بھی یہ بات غلط ہوئی کیونکہ مسیحیوں کو ترقی تین سو سال واقعۂ صلیب کے بعد ملی اور اس وقت تک ایک آدمی بھی مسیح کے زمانہ کا زندہ نہ تھا اب یہ پادری صاحبان جو تصدیق کے معنے اس کے سچا ہونیکا اقرار کرتے ہیں۔ ہمیں بتائیں کہ قرآن کریم اس قسم کی باتوں کی کس طرح تصدیق کر سکتا ہے۔

بڑی بات تو یہ ہے کہ مسیحی صاحبان کے نزدیک اناجیل میں مسیح کی خدائی اور اقنوم ثلاثہ کا ذکر ہے اور قرآن کریم فرماتا ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (مائدہ ع ۱۰) یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں اللہ تین اقنوم میں سے ایک اقنوم ہے (یعنی نصارٰی) وہ کافر ہیں اور حق یہی ہے کہ دُنیا کا معبود صرف ایک ہی ہے اور اگر یہ شرک کرنے والے لوگ اپنے شرک سے رُکیں گے نہیں تو جو ان میں سے کفر پر اصرار کریں گے انہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔ یہ آیت اور ایسی ہی اور بہت سی آیات صاف بتاتی ہیں کہ قرآن کریم اس انجیل کا یقیناً مصدق نہیں جسے مسیحی لوگ پیش کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم انجیل کے اس مفہوم کا ہرگز مصدق نہیں جسے آجکل کے مسیحی لوگ پیش کرتے ہیں پھر ان معنوں سے مسیحی لوگ کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

قرآن مجید کا عام معنوں کے لحاظ سے تورات اور انجیل کا تصدیق کرنا ان کے محرّف ہونے کی وجہ سے ناممکن ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ تصدیق انسانوں کی دو طرح ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ کسی انسان کو راستباز کہا جائے دوم یہ کہ اسکی کسی بات کو سچا ثابت کر دیا جائے خواہ زبان سے مثلاً کہا جائے کہ اس قول میں یہ سچا ہے یا فعل سے کہ عملاً اس کے قول کی تصدیق کی جائے مثلاً اس نے اس کے متعلق کسی کام کے کرنے کی خبر دی ہو اور یہ وہ کام کر دے لیکن کتب سماویہ کی تصدیق تین طرح ہوتی ہے اس طرح بھی کہ انہیں کلی طور پر سچا کہا جائے اس طرح بھی کہ ان کے بعض حصص کی تصدیق کی جائے اور اس طرح بھی کہ ان کی ابتدائی حالت کی تصدیق کی جائے مثلاً اس امر کا اقرار کہ وہ ابتداء میں خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اور ان کے پیش کرنے والے راستباز تھے جھوٹے نہ تھے گو اب اس کتاب میں لوگوں نے خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔

کتب سماویہ کی تصدیق تین طرح ہوتی ہے

مَیں ثابت کر چکا ہوں کہ کلی تصدیق پہلی کتب کی نہ تو ممکن ہے اور نہ قرآن کریم ایسا کر سکتا ہے ممکن اس لئے نہیں کہ وہ سب کتب اس وقت دُنیا میں موجود ہی نہیں اور قرآن کریم کی شان کے لائق اس لئے نہیں کہ وہ خود ہی ان کتب کی غلطیاں بیان کرتا ہے پس جب وہ ان کتب کی غلطیاں بیان کرتا ہے تو ان کی تصدیق کیونکر کر سکتا ہے۔ اب صرف دو طریق تصدیق کے رہ گئے جزئی تصدیق یا ابتدائی حالت کی تصدیق سو سابق

کتب کی تصدیق قرآن کریم انہی دو طریق سے کرتا ہے جو کتب تو دنیا میں موجود ہیں ان کی تو دونوں قسم کی تصدیق کرتا ہے یعنی ان کے بعض مسائل کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی بعض پیشگوئیوں کو اپنی ذات میں پورا کر کے انہیں سچا ثابت کرتا ہے دوسری تصدیق وہ یہ بھی کرتا ہے کہ سب کتب سماویہ کے متعلق وہ یہ خبر دیتا ہے کہ جس وقت انہیں دنیا کے سامنے پیش کیا گیا وہ سچی تھیں۔ وہ حضرت آدمؑ کے الہام۔ حضرت نوحؑ کے الہام حضرت ابراہیمؑ کے الہام حضرت موسیٰؑ کے الہام حضرت مسیحؑ کے الہام حضرت کرشنؑ کے الہام حضرت رامچندرؑ کے الہام حضرت زردشتؑ کے الہام۔ اور باقی ان تمام انبیاء کے الہاموں کی تصدیق کرتا ہے جو وقتاً فوقتاً اور مختلف ملکوں اور قوموں میں ظاہر ہوئے خواہ ان کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں

قرآن مجید کی دو طرح سے کتب سماویہ کی تصدیق۔

چنانچہ فرماتا ہے وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَن يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ ○ (مومن ع) یعنے محمد رسول اللہ ہم تجھ سے پہلے بہت سے رسول بھیج چکے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے قرآن میں کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا اور یاد رکھو کہ کسی رسول کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی نشان لے آئے پس جب اللہ کا حکم آ جائے تو سچائی کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور جو بھی جھوٹا ہو ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ صرف وہی نبی خدا کی طرف سے نہیں ہیں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر آ چکے ہیں پھر یہ سوال اُٹھایا ہے کہ جن کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہم کیونکر جانیں کہ وہ سچے تھے تو اسکی یہ علامت بتائی ہے کہ رسول نشان لے کر آتا ہے اور نشان خدا تعالیٰ کی امداد کے بغیر کوئی نہیں دکھا سکتا۔ پس جو نشان دکھاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے پھر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ بہت سے نشان یعنی شہادت اور واقعات کے تفصیلی علم کو چاہتے ہیں اور مختلف اقوام جن لوگوں کو بطور اپنے نبیوں کے پیش کرتی ہیں ان کے تفصیلی حالات کا ہمیں علم نہیں پھر انکی سچائی کو کس طرح معلوم کریں تو اس سوال کا جواب اس طرح دیا کہ ایک نشان ایسا ہے جو سب نبیوں میں مشترک ہے اور وہ اپنی شہادت ہر وقت ساتھ رکھتا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی نبی دنیا میں آتا ہے آخر کار (۱) اس کے مخالف ہلاک ہو جاتے ہیں اور (۲) اس کا نام دنیا میں رہ جاتا ہے اور اس کے اتباع کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جس مدعی الہام کی تائید میں یہ امر دیکھو سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کی تائید اس کے حق میں ہے اور وہ جھوٹا نہیں۔

تصدیق کو لما معکم کے الفاظ کے ساتھ مقید کرنے کے لحاظ سے قرآن مجید کے تورات و انجیل کے مصدق ہونے کا مطلب۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم صرف انہی انبیاء کا مصدق نہیں جن کے نام اس نے لئے ہیں بلکہ اُن انبیاء کا بھی مصدق ہے جن کے نام اس نے نہیں لئے اور جب وہ ایسے انبیاء کا مصدق ہے تو ان کے کلام کا بھی مصدق ہے اور اس نابید یا غیر مذکور کلام کی تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اجمالاً ایمان لایا جائے کہ وہ سچے ہیں پس تصدیق کے دوسرے معنے اجمالی ایمان کے ہیں یعنی ان کلاموں کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی اور ایسی ہی تصدیق قرآن کریم یہود و نصاریٰ کی کتب کی بھی کرتا ہے پس اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن کریم انکی موجودہ صورت کو صحیح قرار دیتا ہے ظلم ہے اور دیگر آیات قرآنیہ اور واقعات اور خود انکی کتب کی اندرونی شہادت کے خلاف ہے۔

یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آیت زیر بحث میں تورات و انجیل کی تصدیق کا ذکر نہیں بلکہ لِمَا مَعَكُمْ کی تصدیق کا ذکر ہے یعنے قرآن جو کچھ انکے پاس ہے اس کا مصدق ہے اب اگر ان الفاظ کے وسیع معنے لئے جائیں تو ان کے یہ معنے ہونگے کہ ان کے قصوں کہانیوں کی بھی وہ تصدیق کرتا ہے لیکن یہ معنے بالبداہت باطل ہیں اور یہ ماننا پڑے گا کہ ان الفاظ کو بعض قیود سے مقید کرنا ہوگا اور وہ قیود معقول طور پر یہی ہو سکتی ہیں (۱) اس کے یہ معنے لئے جائیں کہ جو مضمون اس قسم

کی آیات سے پہلے یا بعد میں بیان ہو رہا ہے یہ الفاظ ساری کتاب کی نہیں بلکہ صرف اسکی تصدیق کے بارہ میں ہیں اور یہ مطلب لیا جاوے کہ اس مسئلہ کے متعلق جو تعلیم ہماری ہے وہی تمہاری کتب میں ہے پس تصدیق خاص ہوگی نہ کہ عام۔ انہی معنوں کے رو سے یعنے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ یہ قرآن کریم تمہاری کتب میں بیان شدہ پیشگوئیوں کی تصدیق کرتا ہے یعنی انہیں پورا کرتا ہے (۲) یا پھر لِمَا مَعَكُمْ کو اس حد بندی سے محدود کیا جائے گا کہ تمہارے پاس جو خدا کا کلام ہے اسکی تصدیق قرآن کریم کرتا ہے اور ان معنوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں اس میں کیا شک ہے کہ پہلی کتب میں جو خدا کا کلام ہے اس کی تصدیق ہر دوسرے آسمانی کلام کو کرنی چاہیئے مگر اس تصدیق کے یہ معنے نہیں ہوسکتے کہ جو کچھ بھی ان کتب میں ہے وہ ضرور خدا کا کلام ہے۔

اس سوال کے متعلق ایک اور بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ پہلی کتب کے لئے جس جس جگہ قرآن کریم میں تصدیق کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کا صلہ لام آیا ہے سوائے دو جگہوں کے جہاں کوئی صلہ استعمال نہیں ہوا لیکن جہاں قرآن کریم یا رسول کریم کی نسبت یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کا صلہ با آتا ہے اور لغت سے بھی ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تصدیق کے معنے اس کو سچا قرار دینے کے ہوں وہاں با صلہ آتا ہے پس اس اختلاف سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاں جہاں پرانی کتب کی نسبت یہ لفظ استعمال ہوا ہے اس کے اور معنے ہیں اور وہ یہی ہوسکتے ہیں کہ پہلی کتب میں جو پیشگوئیاں تھیں قرآن کریم ان کا پورا کرنے والا ہے یہ نہیں کہ ان کے اندر جو کچھ غلط یا درست لکھا ہوا ہے اس کو سچا قرار دیتا ہے قرآن کریم کی بعض آیات بھی اس استدلال کی تصدیق کرتی ہیں سورۂ احقاف میں ہے قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۝ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ (احقاف ع ۱) یعنے اے لوگو بتاؤ تو سہی کہ اگر یہ کتاب اللہ تعالٰی کی طرف سے ہوئی اور تم نے اس کا انکار کر دیا تو کیا بنے گا اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اپنے مثل نبی آنے کی خبر دی ہے پس وہ تو ایمان لے آیا اور تم نے تکبر سے کام لیا یاد رکھو کہ اللہ ظالموں کو کبھی کامیاب نہیں کرتا اور کافر مسلمانوں کے حق میں کہتے ہیں کہ اگر اس کلام میں کوئی بھلائی ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے کس طرح ایمان لے آتے بات یہ ہے کہ چونکہ ان کو ہدایت نہیں ملی اب تو انہوں نے یہی کہنا ہوا کہ پہلے کلام بھی جھوٹے تھے یہ بھی ویسا ہی جھوٹ ہے اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گذر چکی ہے جو لوگوں کو ہدایت دیتی تھی اور رحمت کا موجب تھی اور اب یہ کتاب اس کی مصدق ہے اور عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ ظالموں کو ڈرائے اور محسنوں کو بشارت دے۔

لفظ تصدیق کے ساتھ دو مختلف صلے لاکر دو مختلف باتوں کی طرف اشارہ۔

ان آیات سے پہلے کی آیات پڑھو تو معلوم ہوگا کہ اس جگہ یہود نہیں بلکہ کفار مکہ مخاطب ہیں ان سے کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اپنے مثیل کی خبر دی تھی (جس میں یہ بھی خبر تھی کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا) اب کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ موسیٰ نے بنو اسحاق میں سے ہو کر اسپر ایمان کا اظہار کیا اور تم جن کو عزت ملی تھی اپنی قوم کے نبی کے ماننے میں تکبر سے کام لے رہے ہو اسپر کفار کا اعتراض بیان فرمایا ہے کہ ہم تو اس کے جھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اور اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ اس کو ماننے والے ادنیٰ لوگ ہیں بڑے لوگ تو

سب اس کے مخالف ہیں اگر یہ سچا ہوتا تو سب سے پہلے ہمیں اسپر ایمان لانے کا موقعہ ملتا۔ اس کا جواب یہ فرمایا کہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب گذر چکی ہے جو اپنی ہدایت اور فائدہ کے لحاظ سے اپنی سچائی کا ثبوت دے چکی ہے اس میں اس کتاب کے بارہ میں پیشگوئیاں ہیں جن کو یہ کتاب پورا کرتی ہے چنانچہ ان پیشگوئیوں کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس کتاب کی زبان عربی ہوگی اور دوسری یہ کہ اس کی قوم کے لوگ اس کے مخالف ہونگے اب ان صدیوں پہلے کی پیشگوئیوں کو جب یہ کتاب پورا کرتی ہے تو تم اس کا انکار کیونکر کرسکتے ہو

آئندہ شریعت کے عربی زبان میں ہونے کی پیشگوئی استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ سے نکلتی ہے جہاں بتایا ہے کہ آنے والا موعود بنو اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنو اسمٰعیل میں سے ہوگا اور اس کی مخالفت کی خبر استثنا باب ۳۳ آیت ۲ سے نکلتی ہے جہاں لکھا ہے کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ہوگی یعنی وہ ضرورت کے موقعہ پر جنگ کرے گا اور جنگ کی اجازت دے گا۔ ظاہر ہے کہ جنگ کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب قوم مخالفت کرے اور مخالف زبردست ہوں۔ پس مکہ والوں کا یہ کہنا کہ ہم جو بڑے لوگ ہیں ایمان نہیں لاتے یہ ان کے سچا ہونے کی دلیل نہیں بلکہ قرآن کریم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے موسیٰ کی خبر کا ایک اور حصہ پورا ہوا اور ایک طرف اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہوئی تو دوسری طرف حضرت موسیٰ کی سچائی ظاہر ہوئی۔

وَلَا تَكُونُوا الخ کا تشریح۔

اس آیت سے تصدیق کے معنے بالکل واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ زبانی تصدیق کہ تورات سچی ہے کفار مکہ پر کیا اثر کرسکتی تھی وہ قرآن اور تورات دونوں کو جھوٹا سمجھتے تھے کفار مکہ پر وہی تصدیق حجت ہوسکتی تھی جس میں کسی پیشگوئی کے پورا ہونے کا ذکر ہو کیونکہ پیشگوئی خواہ کسی نبی کی ہو چونکہ علم غیب پر مشتمل ہوتی ہے ہر ایک شخص پر حجت ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت میں تصدیق کے معنے پیشگوئی پورا کرنے کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتے اور یہی معنی ہیں جو مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ والی آیت اور اسی قسم کی دوسری آیات میں استعمال ہوئے ہیں وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ۔ اس جملہ کا پہلا حصہ جمع ہے اور دوسرا مفرد یعنی لَا تَكُونُوا کے معنے ہیں کہ اے بنی اسرائیل تم نہ بنو اور اس کا جواب کہ کیا نہ بنو یہ دیا ہے کہ اوّل کافر نہ بنو اور کافر مفرد ہے اُردو کے لحاظ سے تو اسپر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ اردو میں ایسے موقعہ پر مفرد کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں لیکن عربی کے محاورہ کے مطابق یہ قابلِ اعتراض ہے کیونکہ عربی میں اس جگہ جمع کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عربی کے علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ جب افعل التفضیل کا صیغہ استعمال ہو جیسا کہ اوّل کا لفظ ہے اور وہ کسی ایسے نکرہ کی طرف مضاف ہو جو صفت کا صیغہ ہو جیسا کہ کافر کا لفظ ہے تو اس وقت اس نکرہ کو جو صفت کا صیغہ ہو مفرد لانا بھی جائز ہے اور جمع لانا بھی جائز ہے اور اس کی مثال کے طور پر فرّاء نے ایک شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے۔ ؎

وَإِذَا هُمُ طَعِمُوا فَأَلْأَمُ طَاعِمٍ
وَإِذَا هُمُ جَاعُوا فَشَرُّ جِيَاعِ

یعنی جب وہ قوم کھاتی ہے تو کھانے والوں میں سے سب سے بری ہوتی ہے اور جب وہ بھوکی ہوتی ہے تو بھوکوں میں سے بدترین ہوتی ہے۔ اس شعر میں پہلے مصرعہ میں طَاعِمٍ کا فرد کی طرح مفرد آیا ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں جِيَاعٍ جمع کا صیغہ آیا ہے گویا ایک ہی شعر میں دونوں طرح کا محاورہ استعمال ہو گیا ہے۔

جب صفت نکرہ افعل التفضیل کا مضاف الیہ ہو تو فرّاء کے نزدیک مِنْ کے بعد فعل استعمال کرکے اس کے معنے کئے جاتے ہیں مثلاً اس شعر میں طَاعِمٍ کے معنے مِنْ طَعِمَ کئے جائینگے اور آیت میں کافر کے معنے مِنْ كَفَرَ کئے جائیں گے بعض دوسرے نحویوں نے کہا ہے کہ اس صورت میں یہ توجیہ

ہوگی کہ اوّل فریق کافر بہ یعنی ابتدا ہی میں کفر کرنے والے گروہ میں شامل نہ ہو بعض دوسروں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ وَلَا یَکُنْ کُلُّ وَاحِدٍ مِنْکُمْ اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ تم میں سے ہر ایک اوّل درجہ کے کافروں میں سے نہ بنے سیبویہ امام لغت کہتے ہیں کہ ایسے موقعہ پر مفرد نکرہ جمع کے معنے دیتا ہے اور اس جملہ کی ترکیب یوں ہے لَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرِیْنَ بِہٖ اوّل درجہ کے کافروں میں سے نہ بنو (بحر محیط زمخشری) اس کے یہ معنے نہیں کہ پہلے کافر نہ بنو ہاں دوسروں کے بعد بیشک کفر کرو۔ یہ عربی کا محاورہ ہے کہ ایک حصہ جملہ کا بیان کردیتے ہیں اور دوسرا چھوڑ دیتے ہیں اسے وہ تحسین کلام میں سے سمجھتے ہیں اس کے رو سے جملہ یہ ہوگا کہ لَا تَکُوْنُوْا اَوَّلَ کَافِرٍ بِہٖ وَلَا تَکُوْنُوْا اٰخِرَ کَافِرٍ بِہٖ یعنی نہ اس کے کفر میں جلدی کرو اور نہ بعد میں کفر کرو۔ اس کی مثال مفسرین اس شعر سے دیتے ہیں ؎

مِنْ اُنَاسٍ لَیْسَ فِیْ اَخْلَاقِہِمْ
عَاجِلُ الْفُحْشِ وَلَا سُوْءُ جَزَعٍ

وہ شخص ایسے لوگوں میں شامل ہے جن کے اخلاق میں نہ تو فحش میں جلدی کرنا شامل ہے اور نہ سخت گھبرانا۔ وہ کہتے ہیں اس کے یہ معنے نہیں کہ فوراً فحش کو اختیار نہیں کرتا بلکہ دیر سے کرتا ہے بلکہ مُراد یہ ہے کہ فحش کو نہ جلدی اختیار کرتا ہے نہ دیر سے (بحر محیط)

میرے نزدیک اس کی ایک اور تشریح بھی ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ جب یہ کتاب تمہاری کتب کی پیشگوئیوں کی مصدق ہے تو تمہارا اس کتاب کا انکار کرنا اوّل درجہ کا کفر ہوگا کیونکہ جو لوگ جاہل ہیں ان کا انکار نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور انہیں معذور سمجھا جاسکتا ہے لیکن تم کو معذور نہیں سمجھا جاسکتا۔ گویا یہ مُراد نہیں کہ چھوٹا کفر جائز ہے یا بعد میں انکار کرنا جائز ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کفر بہرحال ناجائز ہے مگر تمہارا کفر تو اوّل درجہ کا کفر ہے اور

زیادہ خطرناک ہے یا یہ کہ تم کو کفار کی اوّل صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ محاورہ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی استعمال ہُوا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (قٓ ع ٢) مَیں اپنے بندوں پر بہت بڑا ظلم کرنے والا نہیں ہوں اس کے یہ معنے نہیں کہ میں تھوڑا ظلم کر لیتا ہوں بلکہ یہ معنے ہیں کہ پہلا مضمون جو گذرا ہے اگر اسے تسلیم کیا جائے تو اللہ تعالیٰ بڑا ظالم ثابت ہوتا ہے مگر وہ ایسا نہیں ہے اُردو میں بھی یہ محاورہ مستعمل ہے کہتے ہیں اتنا قہر کیوں توڑتے ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ چھوٹا قہر بیشک توڑو بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی پر ظلم کرنا تو ناجائز ہے پھر تم اس قدر بڑا ظلم کیوں کرتے ہو یا یہ کہ جھوٹ بولنا تو ناپسندیدہ ہے پھر تم اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولتے ہو۔

کَافِرٍ بِہٖ میں بِہٖ کی ضمیر کا مرجع

کَافِرٍ بِہٖ میں ہٖ کی ضمیر بِمَا اَنْزَلْتُ میں جو مَا ہے اس کی طرف بھی جاسکتی ہے اس صورت میں اس کے معنے ہونگے کہ خدا تعالیٰ کے نئے کلام یعنی قرآن کریم کے کافر نہ بنو اور لِمَا مَعَکُمْ کے مَا کی طرف بھی جاسکتی ہے اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ یہ قرآن تو تمہاری کتب کی پیشگوئیوں کو پُورا کرنے والا ہے دوسرے لوگ ان پیشگوئیوں کے مُنکر ہوں تو ہوں تم کیوں دوسروں سے بھی جلدی کرکے خود اپنی کتب کی تکذیب کرتے ہو۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ میں ثمن سے مراد دنیا کا سامان

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا میری آیات کو چھوڑ کر تھوڑی قیمت نہ لو۔ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ اس زمانہ میں قرآن کریم کے معنوں کو بگاڑنے والے لوگ پیدا ہوگئے ہیں۔ بعض مُلّا چار پانچ آنہ والا قرآن خرید کر دیہاتیوں کے ہاتھوں میں دو چار روپیہ کو فروخت کرتے ہیں اور کوئی اعتراض کرے تو کہتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کا حکم ہے کہ میری آیات کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو مُردوں پر جو قُل کئے جاتے ہیں ان میں بھی اسی بیہودہ خیال پر بناء رکھ کر قرآن بخشا جاتا ہے یہ سب بیہودہ خیالات ہیں اور اس آیت کے یہ معنی

بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ وَ

باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ ۵۴۳ اور

نہیں ہیں اگر اس آیت کے یہ معنے ہوتے تو الفاظ یوں ہوتے وَلَا تَشْتَرُوْا اٰيٰتِيْ بِثَمَنٍ قَلِيْلٍ کیونکہ عربی محاورہ کے مطابق ب قیمت پر آیا کرتی ہے پس تھوڑی قیمت لینی مراد ہوتی تو ب ثمن پر آتی مگر ب ثمن پر نہیں بلکہ آیات پر آئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اشتراً کا لفظ خرید و فروخت کے معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوا بلکہ استبدال کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (بحر محیط) نوٹ ۵۲ میں بتایا جا چکا ہے کہ لغت کے رو سے ایک معنے اشترار کے یہ بھی ہیں کہ ایک چیز کو چھوڑ دیا اور دوسری کو لے لیا لغت میں لکھا ہے وَكُلُّ مَنْ تَرَكَ شَيْئًا وَتَمَسَّكَ بِغَيْرِهٖ فَقَدِ اشْتَرَاهُ (اقرب) یعنی جو شخص ایک چیز کو ترک کر دے اور دوسری کو اختیار کرے اس کے لئے بھی اشتراء کا لفظ عربی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں یہی معنے ہیں اور یہ مطلب نہیں کہ میری آیات دے کر تھوڑا مال نہ لو بلکہ یہ معنے ہیں کہ میری آیات کو نہ چھوڑو اور تھوڑے مال کو اختیار نہ کرو تھوڑے مال سے مراد دُنیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ (نساء ع ۱۱) دنیا کا سب سامان تھوڑا ہے پس مراد یہ ہے کہ دین چھوڑ کر دُنیا کو اختیار نہ کرو۔ اس میں بنی اسرائیل کو زجر کی ہے کہ تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول کرنے سے انکار کرنا باوجود اس کے کہ تمہاری کتب میں ان کی پیشگوئیاں موجود ہیں محض اپنی لیڈری کے کھوئے جانے کے خوف سے ہے تم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا گراں گذرتا ہے اور ان کی مخالفت کر کے اپنی قوم کی سرداری قائم رکھنا زیادہ عزیز ہے گویا دنیا کی معمولی عزت اور تھوڑے سے پیسوں کے لئے تم ان پیشگوئیوں کو ترک کر رہے ہو جو تمہاری کتب میں موجود ہیں۔

یہود کا محض دنیا کی خاطر آنحضرت کا انکار کرنا۔

لَا تَلْبِسُوا

اَلْحَقُّ

اَلْبَاطِلُ

حدیثوں میں آتا ہے دو یہودی عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے واپس جاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ نبی وہی ہے جس کا ذکر ہماری کتب میں آتا ہے لیکن ماننا تو نہیں کیونکہ ہماری جماعت کے لوگ ہمیں قتل کر دیں گے یہی ذہنیت ہے جو اکثر لوگوں کو سچائی سے محروم کر دیتی ہے۔

(مسند احمد حنبل جلد رابع ص۲۳۹)

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۔ اس فقرہ کی بناوٹ بھی وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ کی طرح ہے (دیکھو نوٹ ۵۴۱ سورۃ ہذا) اور یہ پورا جملہ یوں ہوتا ہے وَاتَّقُوْا اِيَّايَ تَنَبَّهُوْا فَاتَّقُوْنِ مجھ سے ڈرو ہوشیار ہو جاؤ اور مجھ سے ڈرو اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان دُنیا کو اس لئے اختیار کرتا ہے کہ زندگی میں تکلیف سے ڈرتا ہے مگر یہ ڈر عبث ہے کیونکہ تکلیف اور آرام خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے پس دُنیا کا آرام بھی خدا تعالیٰ کو خوش کر کے مل سکتا ہے اسے چھوڑ کر نہیں مل سکتا۔

۵۴۳ حل لغات:۔ لَا تَلْبِسُوْا نہی جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور لَبَسَ عَلَيْهِ (يَلْبِسُ) الْاَمْرَ لَبْسًا کے معنے ہیں خَلَطَهٗ وَجَعَلَهٗ مُشْتَبِهًا بِغَيْرِهٖ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ کے ساتھ ملا کر مشتبہ کر دیا (اقرب) پس لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ کے معنے ہونگے کہ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔

اَلْحَقُّ:۔ اَلْحَقُّ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ ہذا ۵۲۷

اَلْبَاطِلُ:۔ اَلْبَاطِلُ نَقِيْضُ الْحَقِّ وَهُوَ مَا لَا ثَبَاتَ لَهٗ عِنْدَ الْفَحْصِ۔ یعنی باطل حق کے مقابل پر